دشمن
احمد اقبال

دشمن

احمد اقبال

کچھ لوگ اب بھی ایسے موجود ہیں جو اپنی اقدار سے نامطمئن ہوتے ہوئے بھی انہیں ہاتھ سے چھوڑنا نہیں چاہتے ...... ایک جذباتی لگاؤ اور مدتوں کی شناسائی کا خیال انہیں اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ ہم انہیں سینے سے لگائے رکھیں...... اسی پس منظر کے گرد گھومتی کہانی ...... جس کے کردار ...... ماضی کے مدفن پر مستقبل کے محل تعمیر کرنا چاہتے تھے۔

لبوں پہ مسکراہٹ بکھیر دینے والے قلم کار کی پرظرافت تحریر سرورق کا تیکھا رنگ

موہن لال کو کچھ اندازہ نہیں تھا کہ داڑھی... کٹاری مونچھوں... سرمہ لگی آنکھوں اور شلوار قمیص کے ساتھ ٹوپی والا ڈرائیور اسے صحیح سمت میں لے جا رہا ہے یا کہیں اچانک وہ کسی اونچی دیواروں والے احاطے میں داخل ہو جائے گا جہاں تیغ آبدار لہراتے لوگ نعرے لگا کے اسے زمین پر گرائیں گے اور قتل کر دیں گے... اللہ کی راہ میں... اور پھر یہ ثواب خود ہی اپنے نامۂ اعمال میں درج کر لیں گے کہ ایک اور کافر کو جہنم رسید کیا۔

ڈرائیور صورت اور لب و لہجے سے شریف اور معزز نظر آتا تھا لیکن نیت کا حال کون جان سکتا ہے... وہاں جو چار، چھ ٹیکسی والے فارغ کھڑے تھے، ان میں سے یہی ادھر آنے پر رضامند ہوا تھا اور وہ بھی انتہائی مناسب کرایہ لے کر... باقی سب اپنے لب و لہجے سے زیادہ خوں خوار لگ رہے تھے۔

موہن لال نے اپنے حلیے اور انداز و اطوار سے بالکل ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ اس ملک میں اجنبی ہے اور سرحد پار سے آیا ہے۔ اس نے عام سی شرٹ پینٹ پہن رکھی تھی اور اس کے جوتے باٹا کے تھے جو ہر سرحد پر ملتے ہیں۔ اس کی خاصی حسین دھرم پتنی نے البتہ اپنی ضد سے کچھ مسائل کھڑے کیے تھے۔ مثلاً وہ اسٹار پلس فیشن کی ساڑی سے دست بردار ہونے کو تیار نہ تھی جس میں اس کی پوری خوب صورت اور سنسنی خیز کمر کا نظارہ موہن لال کو مسحور کر دیتا تھا... اس نے اوما کو بہت سے ایسے مناظر دکھائے جن میں خواتین نے شلوار قمیص پہنی تھی اور وہ زیادہ پُرکشش لگ رہی تھیں... آخری دلیل موہن لال نے یہ دی کہ اچھا پہنو اشتعال انگیز لباس وہاں اغوا کرنے والوں نے درگت بنا دی تو رونا مت... اس کے بعد وہ مان گئی۔

اب وہ سوچ رہا تھا کہ اس نے اوما سے غلط نہیں کہا تھا... یہاں بھی وہ اپنا وہی سلیولیس اور بیک لیس بلاؤز پہن کر آ جاتی تو معلوم نہیں کیا ہو جاتا... کیونکہ شہر میں بھی خواتین جو بے پردہ نظر آئیں، وہ بڑے محتاط انداز میں اپنے جسم کی نمائش کر رہی تھیں۔ یہاں تو خواتین نے خود کو چادروں میں چھپا رکھا تھا اور وہ شٹل کاک برقع بھی نظر آ رہے تھے جن کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ اندر سے کیا برآمد ہوگا... اس نے سنا تھا کہ اندر جرائم پیشہ افراد کلاشنکوف لیے پھرتے ہیں اور ایڈونچر پسند عاشق اس میں روپوش ہو کے دن دہاڑے اپنی محبوبہ سے مل آتے ہیں... کسی گرلز کالج کے ہوسٹل میں یا براہِ راست کسی جلاد صفت ابّا کے گھر میں... ان امکانات کو مسترد بھی نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن موہن لال کا خیال تھا کہ ایسا ہر جگہ ہر وقت نہیں ہو سکتا تھا۔

تاہم ایک فرق واضح تھا۔ کہیں کہیں سرِعام نظر آنے والی خواتین سرتاپا مکمل لباس میں تھیں اور چہرے یا ہاتھوں کے سوا ان کے جسم کا کوئی حصہ دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔ وہ دوپٹے کو بھی سنبھال کے رکھتی تھیں اور اکثر چادر یا شال کو ایسے استعمال کرتی تھیں کہ جسم کا اوپر والا حصہ آنکھوں کے سوا نظر ہی نہ آئے۔ شہروں کے ماحول میں زیادہ فرق نہیں تھا... وہاں اوما ساڑی یا جینز میں پھر سکتی تھی۔

موہن لال پوری کوشش کر رہا تھا کہ اس کا شین قاف درست رہے لیکن یہ احتیاط بھی اتنی ضروری نہیں تھی کیونکہ عام لوگ بھی کوئی کتابی ادبی زبان نہیں بولتے تھے۔ عوامی زبان میں لوگ مطلب سمجھ لینے کو کافی جانتے تھے۔ شہری اردو وہی تھی جو بھارتی فلموں میں ہندی کہلاتی تھی... حد تو یہ ہے کہ اس نے ایک جگہ لڑائی میں وہی گالیاں سنیں جو وہ خود بھی اتنی ہی روانی سے دیتا آیا تھا... وہی ماں بہن کے رشتوں کی ایسی تیسی...

آسمان وہی تھا... زمین وہی تھی... درخت... کوّے...

کتے اور فقیر... بجلی کے تار... چاند سورج... سب یونیورسل ہے، چنانچہ یہاں بھی وہی تھے جو سرحد پار... تاہم یہ حقیقت ایک احساس بن کے ہوا، فضا اور ماحول میں محسوس ہوتی تھی کہ وہ سرحد پار ایک دشمن ملک میں تھا۔

اسے یقین دلایا گیا تھا کہ وہاں اسے کافر مان کے راہ چلتا کوئی بھی شخص بچہ، بوڑھا، جوان ثواب کے لیے قتل کر سکتا ہے۔ اسے کیا معلوم کہ اس ٹیکسی ڈرائیور کے دل میں کیا ہے اور زبان پر کیا... اس میں شک کی کوئی بات ہی نہیں تھی کہ ایک ملک کے رہنے والے دوسرے ملک سے آنے والے کو محض سونگھ کے بتا سکتے تھے کہ وہ پاکستانی ہے یا ہندوستانی... اور ہندو ہے یا مسلمان... جسمانی معائنے سے تصدیق کی نوبت تو بعد میں آتی تھی۔

''میرے تو سر میں درد ہوگیا۔'' اوما نے باہر دیکھتے دیکھتے بیزاری سے اپنا مکھڑا اس کی طرف گھمایا۔ ''موہن! اب اور کتنی دیر لگے گی؟''

موہن کا ہارٹ فیل ہوتے ہوتے رہ گیا۔ اس نے دانت پیستے ہوئے اوما کو آنکھیں نکال کے گھورا۔ ''اب زیادہ دیر نہیں لگے گی۔'' اس نے ہاتھ سے خنجر گھونپنے کا ایکشن بنایا۔

اوما کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوگیا مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ بھگوان کرے اس وحشت زدہ حلیے والے ڈرائیور نے نہ سنا ہو... الو کی پٹھی کو کتنا سمجھایا تھا کہ عام جگہ پر عام لوگوں کے سامنے نام نہیں لینا... یہ سراسر خودکشی ہوگی... ہم

دونوں ایک دوسرے کے لیے ڈیئر استعمال کریں گے۔ منتے کی اماں یا منی کے ابا مشکل ہوگا۔

یہ اوما نے تیسری بار غلطی کی تھی۔ اس کا سوال ہی غلط تھا۔ وہ کیا بتائے کہ جہاں ساٹھ سال پہلے اس کا دادا رہتا تھا، وہ جگہ اب کتنی دور ہے۔ سورگ باشی پتاجی خود بھی آتے تو چکرا جاتے... دنیا ہر جگہ بدل چکی تھی... جو گاؤں تھے، وہ قصبے بن گئے تھے۔ جو قصبے تھے، وہ شہر... سڑکیں، کارخانے، عمارات اور ان میں رہنے والے انسان سب میں کئی گنا اضافہ ہوگیا تھا۔

مثال کے طور پر اس کا اپنا وہ قصبہ جہاں سے وہ دونوں اس سفر پر روانہ ہوئے تھے... اگر وہ تصور میں چالیس سال پہلے کا نقشہ دیکھے تو یہ سب کہاں ہوگا جو آج نظر آتا ہے... کشادہ سڑکیں... بارونق بازار... لوگوں کا ازدحام... خود ان کا چھوٹا سا تین کمروں والا مکان اب اسے یاد بھی نہیں تھا... وہ نئی آبادی کی ایک خاصی بڑی کوٹھی میں رہتے تھے جو تیس سال پہلے موہن کے پتاجی نے بنوائی تھی... اس وقت یہ خاندان کی ضروریات کے لیے بہت تھی... آج اس کے ہر کمرے میں ایک خاندان آباد تھا... سب کا کچن، ڈرائنگ روم اور صحن مشترک تھا... سارے بچے کونوں کھدروں، لاؤنج یا اسٹور میں سوتے تھے۔

اوما نے اس کی طرف دیکھے بغیر انگریزی میں سوال کیا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے... یہ شخص انتہا پسند ہوسکتا ہے؟''

موہن نے اسے ٹالنا مناسب سمجھا۔ ''دنیا میں ناممکن تو کچھ بھی نہیں ہوتا ڈیئر۔''

''کیا اسے شک ہوگا... کہ ہمارا تعلق اس ملک سے نہیں ہے؟''

وہ چڑ گیا۔ ''اسی سے پوچھ لونا۔''

''مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔''

''ڈر کس سے لگ رہا ہے... اور کیوں؟ مجھے تو ایسی کوئی پریشانی کی بات نظر نہیں آتی... سڑک چل رہی ہے... ٹرک اور بس، تانگے اور کاریں سب آجا رہے ہیں... دکانیں کھلی ہوئی ہیں... ہر جگہ لوگ اپنا کام کر رہے ہیں۔''

''وہ سب تو ٹھیک ہے لیکن تم جانتے ہو... دھماکا کہیں بھی ہوجاتا ہے... کسی بھی شہر میں۔''

''ڈیئر... کیا سرحد پار ہمارے ملک میں کچھ نہیں ہو رہا ہے؟ ادھر تامل ٹائیگر... دوسری طرف نکسل باڑی...''

''تم سے بات کرنا بے کار ہے۔'' اوما کی تیوری چڑھ گئی۔

''دیکھو... مرنے کا سوچنے سے کیا ہوگا؟ گھر میں بیٹھے بیٹھے بھی آدمی کا ہارٹ فیل ہوجاتا ہے... تمہارے ابا سو رہے تھے... چھت گر گئی... میرے ماما کو بھینس نے ٹکر ماردی۔''

''لیکن یہ سب وہاں نہیں ہو رہا ہے جو یہاں ہو رہا ہے۔'' اوما خفگی سے بولی۔ ''تم کو سب نے کہا تھا کہ ابھی مت جاؤ... لیکن تمہیں تو جیسے ضد ہوگئی تھی۔''

''میں اور انتظار نہیں کرسکتا تھا۔ حالات کا کیا پتا، کب تک ٹھیک نہ ہوں... لیکن ہمیں حالات سے کیا؟''

''مت بھولو کہ ان کے نزدیک ہم کافر ہیں۔''

وہ ہنسا۔ ''یہاں جو ایک دوسرے کو مار رہے ہیں... سب ایک ہی مذہب کو ماننے والے ہیں... مارنا ہو تو یہ معمولی اختلاف پر ایک دوسرے کو کافر قرار دے کر بھی مار دیتے ہیں... یہ مسئلہ نہ عقیدے کا ہے، نہ مذہب کا... یہ سیاست ہے ڈیئر... عام آدمی کسی سے نفرت نہیں کرتا... کسی کو نہیں مارتا۔''

''ذرا اسے بتاؤ کہ میں کون ہوں۔'' اوما نے طنز سے کہا۔

''کچھ بھی نہیں ہوگا اس سے۔''

''غلط فہمی ہے تمہاری... دو جنگوں نے نفرت کو گہرا کردیا ہے۔''

ڈرائیور نے سر گھمایا۔ ''آپ بالکل فکر مند نہ ہوں میڈم! امن ہو یا جنگ... اگر دشمن بھی مہمان ہے تو ہماری پناہ میں ہے... پھر اس کی حفاظت ہم جان دے کر بھی کرتے ہیں۔''

شاک کا ایک لمحہ بہت طویل ہوگیا جس میں وہ دونوں گنگ اور ساکت و صامت بیٹھے رہے پھر موہن لال نے خود کو سنبھالا... ''تم انگریزی جانتے ہو؟''

''یس سر! میں نے سات سال پہلے گریجویشن کیا تھا... نوکری نہیں ملی... گھر کے حالات اچھے نہیں تھے... میرے والد نے یہ سرکاری اسکیم کی یلو کیب لی تھی... ان کا بھی انتقال ہوگیا تو گھر کی ساری ذمے داری مجھ پر آگئی... اب اللہ کا شکر ہے، دن رات محنت کر کے میں اچھی کمائی کر رہا ہوں۔''

''تم... کہاں کے رہنے والے ہو؟''

''یہاں گوجر خان کا... شادی ایک پٹھان لڑکی سے ہوئی۔ اس کا باپ ادھر خیبر ایجنسی کی مسجد میں پیش امام تھا۔ وہ راولپنڈی آگئے اور ایک اسکول میں اسلامیات پڑھاتے رہے۔ اب ان کا بھی انتقال ہو چکا ہے... میرے دو سالے باہر ہیں... امریکا اور کینیڈا میں... مجھے بلاتے ہیں لیکن میں نہیں جاتا... آپ کہاں سے آئے ہو؟''

اچانک داغے جانے والے سوال نے اوما کی حالت غیر کردی۔ موہن نے صرف ایک لمحہ سوچنے میں صرف کیا... پھر کچھ نہ چھپانے اور سب کچھ صحیح صحیح بتانے کا فیصلہ کرلیا۔

''دہلی سے۔''

''اندازہ تو مجھے ہو گیا تھا۔ میرا نام ہے گلباز خان۔''

''میرا موہن لال... یہ میری بیوی ہے اوما دیوی... میرے آباؤ اجداد...''

اوما چکرا گئی۔ ''کس کا تعلق تھا؟''

''ہمارے پُرکھوں کا... باپ دادا کا۔'' موہن لال نے اسے گھورا۔

''تو ایسے کہونا...'' اوما کسمسا گئی۔

موہن لال نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''وہ تقسیم سے پہلے نہ جانے کئی نسلوں سے یہاں آباد تھے۔ ان کا سب کچھ یہیں تھا لیکن پاکستان بن گیا تو انہیں سب کچھ چھوڑ کے جانا پڑا... جیسے اُدھر سے لوگ آئے تھے۔''

گلباز نے سر ہلایا۔ ''کیا کرتے تھے وہ؟''

''میں نے سنا ہے وہ بہت بڑے زمیندار تھے... لاکھوں ایکڑ زمین تھی۔''

''لاکھوں ایکڑ...؟'' گلباز نے بے یقینی سے دہرایا۔

''ہزاروں ہو گی... داداجی کچھ بڑھا چڑھا کے بھی بتاتے ہوں گے۔''

گلباز ہنس پڑا۔ ''ہاں... یہاں بھی جو آیا نواب تھا... بڑے لطیفے بھی مشہور ہو گئے تھے... ہمارے تو وہاں باغات تھے... پوچھو کس چیز کے... تو سر اکڑا کے کہتے تھے... ایک دھنیے کا... دوسرا پودینے کا...''

''ہاں... اُدھر بھی ایسے لوگ پہنچے تھے... کہتے تھے کہ ہمارا بڑا باغ تھا... پوچھو کتنا چوڑا... تو جواب ملتا تھا چھ انچ...''

اوما نے ناگواری سے کہا۔ ''جھوٹ سچ کا ہمیں پتا نہیں۔''

گلباز نے معذرت کی۔ ''معاف کرنا بہن جی... میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا... ننانوے فیصد لوگ تباہ ہو گئے تھے۔''

''داداجی کا شمار علاقے کے رئیسوں میں ہوتا تھا۔ وہ انگریز کے خطاب یافتہ بھی تھے۔ رائے بہادر چمن لال... تم نے نام تو سنا ہو گا؟''

گلباز نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اب ہم تاریخ نہیں پڑھتے... نہ کوئی ہمیں کچھ بتاتا ہے... میں نے ایم اے پاس نوجوانوں کو دیکھا ہے جو نہیں جانتے کہ پہلے پاکستان کے دو حصے تھے... ویسے دیکھا جائے تو یہ میری پیدائش سے پہلے کی بات ہے۔''

موہن لال باہر دیکھتا رہا۔ ''پتا نہیں اب کوئی جاننے والا بھی ملتا ہے یا نہیں؟''

گلباز نے کچھ دیر بعد پوچھا۔ ''اب آپ ایسے ہی آئے ہیں؟ گھومنے پھرنے...؟''

''یہی سمجھ لو... باتیں بہت سنی ہیں... ایک بار دیکھ لیں کہ وہ گاؤں کیسا تھا... وہ لوگ کیسے تھے...؟''

''پھر تو آپ کو مایوسی ہی ہو گی... کیونکہ وہ سب بدل گیا ہے۔''

''پھر بھی... آدمی امریکا چلا جائے یا کہیں اور... اپنے وطن کو کیسے بھول سکتا ہے۔''

''اب کیا وطن۔'' گلباز نے آہ بھری... ''لوگ صرف گاؤں یا شہر ہی نہیں، ملک چھوڑ کے جا رہے ہیں... جہاں چار پیسے ملیں، وہی وطن...''

''میں نے دیکھا ہے... پہلی نسل کا رشتہ رہتا ہے وطن سے... دوسری اگر ماں باپ کے ساتھ کبھی آجائے تو آجائے... پھر سب ختم۔''

اوما نے سلسلۂ کلام منقطع کرنے کے لیے دخل دیا۔ ''اب اور کتنی دور جانا ہے ڈرائیور؟''

گلباز نے مختصر جواب دیا۔ ''ابھی کچھ وقت ہے جی۔''

ٹیکسی مین روڈ کو چھوڑ کر بائیں جانب کی چھوٹی سی سڑک پر دوڑنے لگی۔ ان کے دونوں جانب کھیت تھے۔ اِکّا دُکّا سائیکل یا موٹر سائیکل کے علاوہ ایک سوزوکی پک اپ ان کے پاس سے گزری جس میں ڈھیروں سبزی پر چار چھ افراد چڑھے بیٹھے تھے۔ ان کی خوفناک مونچھیں اور میلی دھوتیاں تھیں... غالباً وہ اپنی فصل کسی قریبی منڈی میں لے جا رہے تھے۔

ٹیکسی اچانک رک گئی۔ ''میں دو منٹ میں آتا ہوں۔''

اوما کا دل دھک سے رہ گیا۔ گلباز ایک آبادی کے باہر بنی ہوئی مسجد میں چلا گیا تھا۔ بس اب خیر نہیں... اس پٹھان کو سب معلوم ہو گیا تھا۔ ابھی اندر سے چار ہٹے کٹے خونخوار جوان .... برآمد ہوں گے جو انہیں گھسیٹ کے اندر لے جائیں گے اور زمین پر گرا کے اسی طرح کاٹ ڈالیں گے جیسے یہ ماس خور گئو ماتا کو تڑپا تڑپا کے مارتے ہیں اور پھر سر سے پیر تک کھا جاتے ہیں... اندر کی کوئی چیز تک نہیں چھوڑتے... کلیجی کو آگ پر بھونتے ہیں... کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا...

اوما نے ان خیالات کا اظہار اپنے پتی پرمیشور سے کرنے میں بھی حرج نہ سمجھا۔ موہن لال کا حال بھی بہت اچھا نہیں تھا لیکن اس نے اپنی مردانگی کی شان رکھنے کے لیے مسکرانا ضروری سمجھا۔ ''تم تو پاگل ہو۔''

گلباز کے آنے تک اوما کے پیٹ میں مروڑ اٹھتے رہے... جب وہ آیا تو اکیلا نہیں تھا... اس کے ساتھ ایک ڈھول جیسے پیٹ اور خوفناک سیاہ داڑھی والا نوجوان شخص بھی

تھا جس نے قریب آ کے موہن لال سے مصافحہ کیا۔

''معلوم ہوا کہ آپ بڑی دور سے تشریف لائے ہیں۔'' آنے والے نے کہا۔ ''اگر ناگوار نہ ہو تو کچھ دیر قیام فرمایئے... کھانے کا وقت ہے۔''

اوما کا دل اچھل کے حلق میں آ گیا... کم بخت زہر دینا چاہتا ہے۔

موہن لال نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ ''بس اب گاؤں پہنچ کے ہی کھانا کھائیں گے۔''

''آپ ہمارے بھی مہمان ہو... لیکن یہاں تو ملے گی دال روٹی...'' وہ شخص گلا پھاڑ کے ہنسا۔

نہ جانے موہن لال کے دل میں کیا آئی کہ وہ ٹیکسی سے اتر گیا۔ اوما کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا... لیکن اس کا خاموش احتجاج رائگاں گیا۔

اس شخص نے انہیں صحن میں لگے درخت کے نیچے ایک چارپائی پر بٹھا دیا۔ وہ کھانا لینے اندر گیا تو اوما بگڑ گئی۔ ''آخر ایسی کیا جلدی تھی کھانے کی؟ اور تم... گاؤں جا کے نماز نہیں پڑھ سکتے تھے؟''

گلباز نے نرمی سے کہا۔ ''ہماری ہر نماز کا ایک وقت مقرر ہے میڈم... اس کے بعد نماز قضا ہو جاتی ہے۔''

موہن لال نے مزید کمینگی کا ثبوت دیا۔ ''اسے ڈر ہے کہ وہ کہیں کھانے میں زہر نہ ملا دے۔''

گلباز ہنسا۔ ''یہ رسک تو آپ کو لینا ہی پڑے گا۔ کیا گاؤں میں ایسا نہیں ہو سکتا؟ ان صاحب کو میں جانتا ہوں... میرا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا... یہ ساتھ والے بیڈ پر تھے... ان کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی... میری چار پسلیاں... ایک بازو... ایک ٹانگ... بڑا آپریشن ہوا تھا... یہ ہر روز مجھے اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاتے تھے۔''

کھانے میں سچ مچ دال روٹی تھی۔ وہ سب چٹائی بچھا کے نیچے بیٹھے۔ اوما نے اب خود کو قائل کر لیا تھا کہ جتنا عرصہ وہ یہاں رہیں گے، بغیر کھائے تو نہیں رہ سکتے... جسے مارنا ہو گا ویسے بھی مار دے گا... مزید اطمینان کی بات یہ تھی کہ دال ایک ہی بڑے پیالے میں تھی... اس میں سے ایک پلیٹ میں نکال کے گلباز اور وہ شخص کھاتے رہے... دوسری پلیٹ میں اوما کے ساتھ صرف موہن لال شریک تھا... گرم روٹی اندر سے ایک بچہ دوڑ دوڑ کے لا رہا تھا جو شاید اس کی ماں پکا رہی تھی۔ پردہ کرنے کی وجہ سے وہ موہن لال کے سامنے نہیں آئی تھی... کھانے کے بعد موہن لال نے اوما سے کہا۔ ''تم اندر جا کے مل آؤ۔''

اعتماد سازی کا یہ پہلا عملی مظاہرہ تھا جو بے حد کامیاب رہا۔ موہن لال نے محسوس کیا کہ اوما اب پہلے کے مقابلے میں بہت ایزی ہو گئی ہے... گلباز اس علاقے میں آتا جاتا رہتا تھا۔ کافی راہ گیروں نے اسے پہچان کے ہاتھ کو سلام کے انداز میں اٹھایا۔

گاؤں اچانک ہی آ گیا۔ سڑک دو چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کے درمیان سے گزری۔ موہن لال نے قدرے بلندی سے پورے گاؤں کی وسعت کو دیکھ لیا۔ اسے گاؤں کہنا غلط تھا۔ یہ اچھا بھلا قصبہ تھا جسے دیکھ کر موہن لال کی پریشانی بڑھ گئی۔ پرانے لوگ تو مر کھپ چکے... ان کی اولادوں کا نام پتا کچھ معلوم نہیں۔ آخر وہ اس جگہ کو کیسے تلاش کریں گے جو پولیس کی زبان میں ''جائے واردات'' تھی۔

بات معمولی ہوتی تو وہ اتنا بڑا خطرہ کیوں مول لیتے لیکن یہ ان کے لیے زندگی اور موت سے بڑا مسئلہ بن گیا تھا۔ یہ ان کے مستقبل کا اور ان کے بچوں کے مستقبل کا سوال تھا۔

جان کی بازی لگانے کا یہ مشکل فیصلہ کرنے میں موہن لال کو کئی سال لگے تھے۔

☆☆☆

رائے بہادر چمن لال علاقے کے رئیس... انتہائی وضع دار اور شریف آدمی سمجھے جاتے تھے۔ 1857ء کی جنگِ آزادی کو انگریز غدر کا نام دیتے تھے۔ ان کے پتاجی روشن لال نے کسی انگریز فوجی افسر کے بیوی بچوں کو جان بچانے کے لیے کہیں چھپا کے رکھا۔ ان دنوں وہ خود بھی بڑے بانکے جوان تھے اور گاؤں میں ان سے اچھی کبڈی کوئی نہیں کھیلتا تھا۔ دس دن بعد انہوں نے میم کو سال بھر کے بچے سمیت چھاؤنی پہنچا دیا لیکن ان دس راتوں میں ایک رات ایسی بھی آئی جب میم نے خود ہی روشن لال کے احسان کا بدلہ چکا دیا۔

روشن لال بعد میں مرتے دم تک اس میم کو اور اس کے ساتھ گزاری ہوئی رات کو یاد کرتے رہے۔ ان کے لیے یہ انعام بھی بہت بڑا تھا لیکن انگریز حاکم اور مالک نے ایک غلام کو اس جاں نثاری اور وفاداری کا انعام زمین کی صورت میں الگ دیا۔ انگریز کا یہی قاعدہ تھا کیونکہ زمین کون سی ان کے باپ کی تھی۔ غلام ملک کی زمین جتنی چاہو بانٹو... جسے چاہو دو... اسے خیرات سمجھو یا انعام...

روشن لال نیچ ذات کے تھے اور کسی سڑک کے کنارے ایک سرائے میں آتے جاتے مسافروں کے گھوڑوں کی سیوا کرتے تھے۔ اچانک وہ بہت بڑے زمیندار بن گئے۔ بے وقوف اہلِ وطن نے ان کی وفاداری کو غداری

اور جاں نثاری کو ضمیر فروشی کا نام دیا لیکن انہوں نے پروانہ کی۔ یہ سب وقتی جذباتی باتیں تھیں... جب زمین نے سونا اگلا اور وہ دولت مند ہو گئے تو گرگٹ کی طرح لمبی زبان نکال کے بکواس کرنے والوں نے گرگٹ کی طرح رنگ بھی بدل لیا۔ ان کی زبانیں روشن لال کو لالہ جی کہنے لگیں اور وہ آتے جاتے انہیں ہاتھ جوڑ کے پرنام کرنے لگے۔

بالآخر بغاوت فرو ہوئی اور انگریز کی حکومت ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک قائم ہو گئی۔ مغل فرماں روا کی عیاش اولادیں دربدر ہو کے درسِ عبرت بن گئیں۔ خود ساختہ اشراف اور امرا خوار ہو چکے اور حریت پسند سولیوں پر لٹک گئے تو انگریز نے غداروں اور غلام زادوں کو انعام و اکرام سے نواز کے عزت دار بنانے کا فیصلہ کیا۔ زمین کے ساتھ خان بہادر یا رائے بہادر کے خطابات بھی ملے... یوں جاگیرداروں کا ایک نیا طبقہ وجود میں آیا۔

روشن لال کو رائے بہادر کے خطاب سے نوازنے کے لیے دلی دربار میں طلب کیا گیا لیکن وہ پہلے ہی پرلوک سدھار چکے تھے۔ یوں چمن لال اپنے پتا کی جگہ بڑی آن بان شان سے خطاب لے کر لوٹے۔ یوں مسافروں کے گھوڑوں کی مالش کرنے والے کا بیٹا چار گھوڑوں کی بگھی میں نکلنے لگا اور نہ صرف رئیس بلکہ سرکاری طور پر معزز ہو گیا۔

چمن لال فطرت اور مزاج کے اعتبار سے باپ کے مقابلے میں کمین ثابت ہوا۔ باپ نے جب غیر آباد زمینوں کو آباد کیا تھا تو اس بات کا خاص خیال رکھا تھا کہ اس کا کوئی ملازم ہندو نہ ہو۔ ذات کے اعتبار سے وہ خود سب سے کم تر تھا... مزارعہ اس کا دیا کھا کے بھی اپنی اونچی ذات پر غرور نہ بھولتا... چمن لال نے ایک قدم آگے جا کے ہندوؤں کو یکسر خارج کر دیا اور صرف مسلمانوں کو ملازم رکھا۔

مسلمانوں میں ذات پات کی بنیاد کوئی نہ تھی لیکن ہندوؤں کے ساتھ رہ کے انہوں نے خود ہی پیشوں کو بنیاد بنا لیا۔ نائی، موچی، قسائی، کمہار، تیلی اور ترکھان بلکہ ہاتھ سے محنت کر کے روزی کمانے والے سب ہی کمین یا رذیل بنا دیے گئے۔ چمن لال نے انہی غریب مسلمانوں کو زمین کاشت کے لیے دی۔ رہائش کے لیے جگہ فراہم کی اور قرضے دے کر ان کے گھر کی عورتوں، بچوں کو بھی گروی رکھ لیا۔ تین چوتھائی منافع خود چمن لال کے حصے میں آیا لیکن بقیہ پچیس فیصد نے بھی ان زرخریدوں کی زندگی میں وہ آسانی پیدا کی کہ وہ چمن لال کی غلامی اور اس سے وفاداری کو اپنی جان سے بڑھ کر سمجھنے لگے۔

گاؤں رفتہ رفتہ آباد ہوا... چمن لال احسان کے بار کی قیمت بھی وصول کرنا چاہتا تھا۔ وقت پڑنے پر وہ مدد کرتا تھا تو مدد کی قیمت بھی مع سود وصول کرتا تھا۔ آبادی میں اضافہ ہوا تو چمن لال نے بچوں کی تعلیم کے لیے ایک اسکول بھی قائم کر دیا۔ کبھی ان کے بچے بھی پڑھیں گے... یہ ایسا خواب تھا جو معاشرے کے کم حیثیت والے لوگ دیکھتے ہی نہیں تھے۔ بچوں سے کوئی فیس نہیں لی جاتی تھی۔ بعد میں اس نے علاج کے لیے شفاخانہ قائم کیا تو گردونواح میں اس کے دیالو ہونے کی دھوم مچ گئی۔ لوگ اسے انسان سے زیادہ دیوتا سمجھ کے پوجنے لگے۔

چمن لال کی دولت میں دن رات اضافہ ہوتا گیا اور اس کے رابطے بڑھتے گئے۔ اس نے اپنے لیے ایک حویلی تعمیر کی جس کا مہمان خانہ باہر تھا... درمیان میں باغ تھا اور اس کے آگے جنگل جہاں تیتر اور بٹیر بہت تھے... پہلے گردونواح کے دوسرے اسی جیسے رئیس اور بعد میں مقامی انگریز حاکم بھی اس کے مہمان ہونے لگے۔ وہ ہر طرح کا شکار کھیلنے آتے تھے۔ ایک طرف حیوان بستے تھے، دوسری طرف انسان... کبھی شکار جنگل سے ملتا تھا تو کبھی خود اپنے پیروں پر چل کے اور باغ سے گزر کے آتا تھا۔

یہ انہی تعلقات کا نتیجہ تھا کہ چمن لال کی اولاد اچھے گھروں میں بیاہی گئی۔ یوں اس کے رشتے دار بھی رئیس اور معزز لوگ ہو گئے جو ذات پات کے مقابلے میں آنے والی دولت کو زیادہ اہم سمجھتے تھے اور عقل مند لوگ تھے۔

چمن لال نے تجارت اور سیاست کے اصول اپنے انگریز آقاؤں سے سیکھے تھے۔ لاٹ صاحب نے تمام راجوں، مہاراجوں، نوابوں اور جاگیرداروں پر اپنے عمل سے واضح کر دیا تھا کہ اپنی رعایا کو تم جیسے چاہو رکھو... انہیں اپنا کتا سمجھو یا غلام... انہیں جوتے مارو یا کوڑے... ننگا بھوکا رکھو یا نجی جیل میں زنجیروں سے باندھ کے... ان کی جان و مال اور آبرو کے مالک تم ہو لیکن تمہاری جان و مال اور آبرو ہمارے ہاتھ میں ہے... جس دن تم نے ہمارے سامنے نظر اٹھائی اور سر نہ جھکایا، اسی دن ہم تمہیں نمونۂ عبرت بنا دیں گے... توپ دم کر دیں گے یا چوک میں پھانسی پر لٹکا دیں گے... ہم ایسا کر چکے ہیں اور تاریخ کا یہ سبق زیادہ پرانا نہیں ہے۔

چمن لال نے ہمیشہ اسی اصول کو سامنے رکھا... وہ حاکموں کے قدموں میں کتے کی طرح لوٹ سکتا تھا اور ان کے جوتے بھی چاٹ سکتا تھا لیکن خود اس کے سامنے کوئی عزت کی بات بھی کرے تو ملزم کی بے عزتی کا تماشائے عبرت سب دیکھتے تھے۔ پھانسی اور عمر قید جیسی انتہائی سزائیں دو تھیں... مجرم کو ننگا کر کے دن رات کسی درخت سے الٹا لٹکائے رکھنا اور اس کے گھر والوں کو پچاس گز کے دائرے سے باہر رہ کے تماشا دکھانا... یا مجرم کے گھر کی بہو بیٹیوں کو ننگا کر کے سارے گاؤں میں پھرانا اور دوسروں کو یہ تماشا دیکھنے پر مجبور کرنا۔

اسی رحم دلی اور سخاوت کے ساتھ سنگ دلی اور بے رحمی کی دوغلی پالیسی کے باعث چمن لال کا نہ کوئی دوست تھا، نہ دشمن... یہ مشہور تھا کہ اس نے ایک اونچی ذات کے برہمن کو اپنے پاؤں دبانے اور کتے نہلانے پر ملازم رکھ لیا تھا۔ نہ جانے کہاں سے اس کی جوان اور خوب صورت بیوی ہفتے میں ایک بار چمن لال کے پاس پہنچ جاتی تھی... چمن لال نے برہمن سے اس کی کوئی اولاد ہونے نہیں دی تھی... اس کے چار بیٹے اور تین بیٹیاں چمن لال نے پیدا کیے تھے... ان کی شادیاں اونچی ذات والوں میں ہوگئیں تو معاہدے کے مطابق اس برہمن ملازم کو اتنی زمین اور نقد روپیا ملا کہ وہ خود رئیس ہو گیا... چمن لال جب نشے میں ہوتا تھا تو اپنی دھرم پتنی سے کہتا تھا کہ اس نے اپنی نیچی ذات کے ہونے کا انتقام لیا ہے... سات برہمن گھرانوں کے پوتّر خون میں اپنا خون ڈال دیا ہے... یعنی خود کو دیوتا سمان ماننے والی ستی ساوتری یہ بات کسی اور کے سامنے کیسے کہہ سکتی تھی۔

اچانک حالات بدل گئے۔ انگریز نے ہندوستان کو آزادی دینے کا فیصلہ تو دوسری جنگ عظیم کے دوران ہی کر لیا تھا لیکن مسلمان اٹھ کھڑے ہوئے کہ ہمیں آزادی ہی نہیں پاکستان بھی چاہیے ورنہ انگریز کے بعد ہم ہندو کے غلام ہو جائیں گے... بیداری کی اس لہر نے سارے ہندوستان کو متاثر کیا تھا تاہم چمن لال مطمئن تھا۔ قرارداد پاکستان کے منظور ہونے سے بھی اسے فرق نہیں پڑا تھا لیکن ہندو مسلم فسادات شروع ہوئے تو اسے فکروں نے گھیر لیا۔ جیسے جیسے یہ امکان واضح ہوتا گیا کہ اس کا گاؤں بھی نئے ملک پاکستان کی حدود میں شامل ہوگا، چمن لال کی نیندیں اڑ گئیں۔

دیکھتے دیکھتے لوگوں کی نظر بدل گئی۔ اسے اتنا وقت ملا تھا کہ حالات خراب ہونے سے پہلے سودا کر لیتا لیکن اس نے فائدہ اٹھانے میں دیر کر دی۔ جب اس نے یہ سوچا تو مسلمانوں کے تیور کچھ اور تھے۔ انہوں نے مونچھوں پر تاؤ دے کر کہا کہ لالہ جی... یہ زمین اپنے ساتھ ہی بھارت لے جاؤ ورنہ ہم تو ایسے ہی لے لیں گے... ایسا سچ مچ ہو گیا۔ جو دوست تھے، دشمن بن گئے... سارے نمک خوار جیسے نمک حرام

ہو گئے... چھپے ہوئے دشمن کھل کر سامنے آ گئے اور بہ قول لالہ جی... گیدڑ بھی شیر بن گئے۔

چمن لال کو اچانک جان بچا کے فرار ہونا پڑا۔ اسے کسی خیر خواہ نے اطلاع دی تھی کہ کل رات حویلی لوٹ لی جائے گی۔ اس کے لیے باہر سے بھی لوگ بلائے گئے ہیں۔ وہ سب کو قتل کر کے حویلی کو آگ لگا دیں گے۔ بچانے کوئی نہیں آئے گا۔ وقت بہت کم تھا... چمن لال نے خود اپنی خواب گاہ کا فرش توڑا اور سارا زیور دبا دیا۔ رات بھر میں سیمنٹ کا فرش سوکھ کے برابر ہو گیا۔ لالہ جی نے دوبارہ اس پر مسہری رکھ دی۔ دن خیریت سے گزرا تو چمن لال کچھ مطمئن ہو گیا کہ حملے کی بات کسی دشمن کی افواہ تھی۔ مگر رات کو جب حملہ آور آئے تو اسے بیوی کا ہاتھ پکڑ کے پچھلی طرف سے نکلنا پڑا۔

چمن لال کی فیملی اِدھر اُدھر بکھری ہوئی تھی۔ ایک بیٹی کا خاندان دور اندیش تھا کہ صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے خرابی سے پہلے نکل گیا۔ دوسری بیٹی لاہور میں تھی اور شاہ عالمی میں سکھوں کے ساتھ اس کا پورا خاندان بھی تہ تیغ ہوا۔ بڑا بیٹا ناخلف تھا۔ باپ نے اتنے ارمانوں سے بیرسٹری پڑھنے ولایت بھیجا تھا کہ جناح اور گاندھی کی طرح سیاست میں نام پیدا کرے گا۔ وہ کسی میم کے عشق کی دلدل میں اتر گیا۔ شادی کے بعد اس نے پتا جی کو مطلع کر دیا کہ اسے آپ حماقت کہیں یا ذلالت... مجھے وکالت اور آپ کی ولدیت دونوں کو چھوڑنے سے فرق نہیں پڑتا... میں ولایت کو اور ولایتی دھرم پتنی کو نہیں چھوڑوں گا۔

چھوٹا روشن لال اور اس کی فیملی بھی جان بچا کے نکلنے میں کامیاب رہے لیکن تن کے کپڑوں کے سوا کچھ بھی ساتھ نہ لے جا سکے۔ لاہور سے روانہ ہونے والی شرنارتھی اسپیشل ٹرین نے انہیں امرتسر پہنچایا... وہاں سے وہ کسی صورت دلی پہنچے تو ان کی فیملی میں ایک فرد کی کمی ہو گئی... راستے کی سختی اور صدمات کی تاب نہ لاتے ہوئے چمن لال کی پچاس سالہ دھرم پتنی اکیلی ہی پرلوک سدھار گئی۔

خود چمن لال حواس باختہ اور نیم پاگل تھا۔ اسے یقین نہیں آتا تھا کہ مغلوں کی طرح اس کی سلطنت بھی بے وجود ہو چکی ہے۔ اس کی شان و شوکت کا سفر ایک صدی بھی جاری نہ رہا تھا کہ اس مفلسی پر تمام ہوا جس میں ذلت تھی... یہی ان کے آباؤ اجداد کا پرانا اثاثہ تھا... زمین، حویلی، نوکر چاکر... دولت مندی کے ٹھاٹ باٹ... اختیار اور دبدبہ... سب جیسے خواب کی طرح تھا... جب آنکھ کھل گئی، نہ زیاں تھا نہ سود تھا۔

شرنارتھی ہر سمت سے دلی پہنچ رہے تھے۔ دہلی میں نظام الدین اولیا کے اسٹیشن سے مسلمان اسی طرح اسپیشل ٹرینوں میں پاکستان جا رہے تھے... دنیا کو جیسے کسی تخریب کار قوت نے الٹا دیا تھا... ایسے میں چمن لال کی بپتا کون سنتا؟ اس کے بیٹے روشن لال نے جیسے تیسے کر کے ایک مکان پر قبضہ کیا جس کے مکین ہجرت کر چکے تھے اور باپ کو پاگل خانے میں چھوڑ آیا۔

مکان میں ضرورت کا سامان موجود تھا۔ انہیں بہت بعد میں پتا چلا کہ مکان کسی مسلمان سرکاری ملازم کا تھا۔ وہ بیوی کو لینے سسرال گیا... وہ خوش حال لوگ تھے اور جہاز سے بمبئی جانے کے لیے تیار بیٹھے تھے جہاں سے وہ بحری جہاز میں کراچی جاتے... انہوں نے داماد صاحب کو واپس جانے ہی نہیں دیا۔ چمن لال کے ملازموں کے گھر بھی اس سے بہتر ہوتے تھے لیکن فاقے میں سوکھی روٹی بھی اس کیک سے اچھی لگتی ہے جو بھرے پیٹ والوں کے لیے بدہضمی کا باعث ہوتا ہے۔

روشن لال سب سے پہلے فکرِ معاش کے لیے نکلا اور کسی نے اس کی دکھ بھری کہانی سن کے ملازمت بھی دے دی۔ .... رحم دلی کا جذبہ اس وقت دونوں طرف بہت زوروں پر تھا۔ روشن لال نے اس سے فائدہ اٹھایا اور نئی نئی زیادہ دل پر اثر کرنے والی کہانیاں سنا کے آئے دن نئی ملازمت حاصل کرتا رہا... وہ ذہین آدمی تھا اور موقع سے فائدہ اٹھانا سیکھ چکا تھا۔ پھر اسے ایک سچا ہمدرد دوست مل گیا۔ اس نے سمجھایا کہ بیٹے... نوکری تمہارے باپ نے نہیں کی... تم کب تک جھوٹ بول کے لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کرو گے اور کہاں تک... جیسے مکان پکڑا ہے، ایسے ہی کوئی دکان پکڑو۔

اسی مہربان دوست کی راہنمائی... حوصلہ افزائی اور مدد سے روشن لال نے ایک دکان کا تالا توڑا... راتوں رات ''مہتا اینڈ برادرز'' کا بورڈ ہٹا کے چمن لال اینڈ سنز کا بورڈ لگایا اور دکان کا مالک بن گیا۔ دکان میں بجلی کا سامان تھا۔ جب مل ملا کے اور بیوی کے دونوں سونے کے کڑے دے کر اس نے دکان اپنے نام الاٹ کرا لی اور وہ زمینداری سے بزنس کی طرف گیا تو اس پر اپنی کاروباری صلاحیت کے جوہر کھلے... پہلے اس نے بجلی کا کام کیا پھر اس کا دھیان ریڈیو کی طرف گیا جو تیزی سے مقبول ہوتے جا رہے تھے۔

مارکیٹ میں کم قیمت ہونے کے باعث انگلینڈ کے بنے ہوئے ریڈیو ہی زیادہ ملتے تھے۔ ان میں جنرل الیکٹرک کمپنی... بش پائی اور مرفی جیسے نام لوگوں کی زبان پر تھے۔ حکومت انگریز کی تھی۔ جرمنی اور جاپان جنگِ عظیم میں ان

کے حریف تھے۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ ان کی مصنوعات کی فروخت یہاں ہو... روشن لال نے جرمنی کی شہرت سن کر جرمن ریڈیو منگوائے... ان کی خوب صورتی اور اعلیٰ معیار نے لوگوں کو متوجہ کرلیا۔ ایک دم جرمنی کے ریڈیو مقبول ہو گئے۔ ان کی فروخت نے روشن لال کو بہت فائدہ پہنچایا۔ ٹیلی ویژن کا دور شروع ہونے سے پہلے ہی وہ لکھ پتی بن چکا تھا۔

اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد پتاجی رائے بہادر چمن لال کو گزرنا ہی تھا... وہ سرکاری پاگل خانے میں پرانے وقتوں کی باتیں کرتے، پرانے لوگوں کو پکارتے بھگوان کے پاس چلے گئے۔ روشن لال کی بیوی نے بھی کم ہمت نہیں کی۔ وہ بڑی تن دہی سے بچے جننے میں لگ گئی اور تاج محل میں سوئی ہوئی ممتاز محل کے مقابلے پر اس نے بھی چودہ بچے جن دیے... ان میں دس بیٹیاں تھیں اور چار بیٹے... پہلے ان بچوں کو پالنے اور پھر جہیز دے دے کر دس بیٹیوں کو گھر سے رخصت کرنے کے چکر میں روشن لال کی حالت اس دریا جیسی رہی جس میں آنے والا سارا پانی نہروں میں بہہ جائے۔

پیچھے رہ جانے والے چار سپوت ماں کے چاہنے اور باپ کی زور زبردستی کے باوجود عالم فاضل نہ بنے۔ انہوں نے نوجوانی کا بہترین وقت آوارہ گردی میں صرف کیا اور جوانی آنے سے قبل ہی جوان بھی ہو گئے۔ باپ دن رات کمانے میں لگا ہوا تھا اور پیسا خود ہی آرہا تھا تو وہ تردد کیوں کرتے... میٹرک تو انہوں نے رو دھو کے کرلیا لیکن اس کے بعد اتفاقِ رائے سے اس نتیجے پر پہنچے کہ کامیابی کا تعلیم سے کوئی تعلق نہیں... خصوصاً خوش حالی کا... باپ کی اور اس سے پہلے دادا کی مثال ان کے سامنے تھی... وہ دیکھ رہے تھے کہ ایم اے پاس کالج کے پروفیسر سے زیادہ کچھ نہیں بنتے اور ان کی ساری عمر بسوں میں دھکے کھاتے یا سائیکلوں پر سفر کرتے گزرتی ہے۔

وہ باری باری کاروبار میں باپ کی مدد کرنے لگے اور ماں انہیں باری باری بیاہ کے بندھن میں جکڑتی گئی۔ دیکھنے میں وہ سب بڑی معصوم، سگھڑ اور سعادت مند لڑکیاں لگتی تھیں لیکن بیویاں بن کے انہوں نے رنگ ڈھنگ بدلے اور اپنے شوہروں کو نکیل ڈال دی... روشن لال کی بیوی کا سارا وقت چار بہوؤں سے چونکھی لڑنے میں گزرتا تھا۔ وہ رات کو شوہروں سے لڑتی تھیں کہ ساری عمر اس گھر کے دو کمروں اور باپ کے مقرر کیے ہوئے وظیفے میں گزارہ کیسے ہوگا... آخر تم خود اپنی کمائی کب لاؤ گے؟

شوہر کیا کرتے... باپ ساری دولت پر سانپ بنا بیٹھا تھا۔ وہ مالک بھی تھا اور کنجوس بھی... بیٹے غبن کریں تو فوراً پکڑے جاتے تھے۔ بیویاں کبھی احتجاج کرنے کے لیے روٹھ کے میکے جا بیٹھتی تھیں مگر کچھ دن بعد شوہر منا لاتے تھے ورنہ وہ خود ہی تھک ہار کے لوٹ آتی تھیں... میکے میں کون سے نوٹ چھاپ کے بانٹنے والے بیٹھے تھے۔

بچے اور جھگڑے بڑھتے گئے... ایک کی بیوی نے تو حد ہی کردی۔ اس نے شوہر کو دھمکی دی کہ فلاں اس پر ڈورے ڈال رہا ہے اور وہ اسی کے ساتھ فرار ہو جائے گی۔ شوہر نے کہا۔ ''جاتے وقت دروازہ بند کر جانا...'' اور منہ پھیر کے سو گیا۔ شوہر سب ایک جیسے مجبور تھے اور ایک ہی بات کہتے تھے... بس کچھ دن صبر کرو... بڈھا مر جائے تو کاروبار ہمارے ہاتھ میں ہوگا اور پھر سب اپنا... وارے نیارے... عیش ہی عیش... بیویاں دل میں خیال آنے کے باوجود یہ نہیں کہہ سکتی تھیں کہ آخر تم کوشش کیوں نہیں کرتے؟

جب وہ شبھ گھڑی آئی... کسی کی کوشش کے بغیر... اور دنیا کی رسم کے مطابق سوگ کا ڈراما بھی ختم ہو گیا تو روشن لال اینڈ سنز الیکٹرانکس میں حصے داری کے فساد کا آغاز ہوا... بڑے بھائی کو پتا کا رول اور بزنس کا کنٹرول دینے کا خاندانی اصول اب نہیں چل سکتا تھا۔ ایک دکان کے چار الگ حصے نہیں ہو سکتے تھے۔ انجام کار دکان فروخت ہو گئی اور حاصل ہونے والی رقم سب نے آپس میں بانٹ لی۔ دس بہنوں کو پھوٹی کوڑی نہ ملی کیونکہ جہیز میں وہ اس سے کہیں زیادہ لے جا چکی تھیں جو بھائیوں کو ملا تھا... دو چار ایسے لالچی اور کمین بہنوئی تھے کہ انہوں نے بیویوں کو مارا کوٹا اور گھر سے نکالا کہ جاؤ، باپ مرا ہے تو کچھ لاؤ... لیکن حاصل کچھ نہ ہوا... گھر کی مالک اب بھابیاں تھیں۔

چار بھائیوں کو جو رقم ملی، کم نہ تھی اگر وہ باپ کی عقل اور مالیاتی ڈسپلن سے کام لیتے تو بہت کچھ کر سکتے تھے لیکن وہ تمام عمر کے ترسے ہوئے تھے اور بیویوں نے سالہا سال کے مطالبات کی فہرست سامنے رکھ دی تو تین اپنی کمزوری کا شکار ہو گئے... صرف ایک کامیاب رہا... اس نے پرانی بیوی کو نکال باہر کیا اور اپنی پسند کی برانڈ نیو بیوی لے آیا جس کا تعلق بھی کاروباری خاندان سے تھا... ایک نے ذاتی کار کو ٹیکسی بنا لیا... دو کا سلسلہ روتے پیٹتے چلتا رہا... وہ کبھی نوکری کرتے... کبھی چھوٹا موٹا کوئی کاروبار۔

اچھی بات یہ ہوئی کہ باپ نے سر چھپانے کی جو جگہ چھوڑی تھی وہ ان کے پاس تھی ورنہ دلی میں کرائے آسمان کو چھو رہے تھے... شاید یہ کوٹھی بھی فروخت ہو جاتی لیکن ماں اڑ

گئی کہ میرے جیتے جی یہ نہ ہوگا اور کوٹھی پتا جی نے اسی کے نام کر رکھی تھی، چنانچہ سب بے چینی سے اس کی وفات حسرت آیات کا انتظار کرنے کے سوا کیا کر سکتے تھے۔

ایک ہی گھر میں غربت اور امارت کے فرق کے ساتھ رہنا عذاب تھا لیکن چاروں بھائی مجبور تھے...ان کی بیویاں دن رات لڑتی تھیں...طعنے دیتی تھیں اور ان کے بچے جو آپس میں فرسٹ کزن تھے، سب دیکھتے اور سنتے تھے اور یہ سمجھنے میں حق بجانب تھے کہ ان کی بدقسمتی کے ذمے دار دوسرے ہیں۔ وہ خود غرض...تنگ دل اور کمینے ہوتے جا رہے تھے کیونکہ والدین انہیں ایسا بنا رہے تھے۔

موہن لال سب سے چھوٹا اور ماں باپ کا لاڈلا تھا۔ وہ بڑے بھائیوں کے مقابلے میں ذہین اور بامروت بھی تھا اور اسے بیوی بھی ایکسپورٹ کوالٹی کی ملی تھی۔ خوب صورت...سمجھ دار اور ہمدرد...ان کا ایک دھانسو قسم کا فلمی عشق چلا تھا جس میں ظاہر ہے عقل کا دخل نہ تھا لیکن قسمت مہربان تھی کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ یوں فٹ بیٹھ گئے جیسے ڈبے سے نکلنے والے چمکتے ہوئے جوتوں کا جوڑا دونوں پیروں میں فٹ ہو جائے...کوئی کسی کو نہ کاٹے... چنانچہ ان کا عشق بھی حیرت انگیز طور پر چار سال بعد بھی باقی تھا... یہ پہلا چمتکار تھا۔

موہن لال کی زندگی میں دوسرا چمتکار یہ ہوا کہ اس کی بیوی نے کم بچوں پر اکتفا کر لیا... بچے دو ہی اچھے کے گولڈن پرنسپل کے مطابق...ان میں بڑا لڑکا تھا اور چھوٹی لڑکی...لیکن اصل چمتکار اس کے سورگ باشی دادا رائے بہادر چمن لال نے دکھایا...وہ ایک رات اپنی دھوتی چوٹی اور سادھوؤں جیسی داڑھی کے ساتھ موہن لال کے خواب میں نمودار ہوئے... پرلوک سدھارتے وقت ان کا ڈیزائن یہی تھا۔

حسبِ عادت انہوں نے موہن لال کو ایک سو ایک گالیاں دیں...موہن لال نے انہیں اسی طرح ہذیان بکتے اور سب کی ایسی تیسی کرتے دیکھا تھا...انہوں نے فرمایا۔ ''سور کے بچے... ہڈحرام کتے...وہ جو سونا میں دفن کر آیا تھا...وہ نکال کیوں نہیں لیتا...چار سو تولے سونے کی قیمت پتا ہے؟''

موہن لال نے سر کھجایا۔ ''مگر دادا... وہ سونا ہے کہاں؟''

''میں بتاتا ہوں...'' انہوں نے ایک شان دار گالی دے کر ایک انتہائی شرمناک حرکت کی۔

وہ گھبرا کے اٹھ بیٹھا...اس کی دھرم پتنی نے گھبرا کے کہا۔ ''کیا ہوا...کسی نے کاٹ لیا؟''

موہن لال بھونچکا بیٹھا رہا۔ بیوی نے پھر پوچھا کہ کیا خواب میں ڈر گئے لیکن جواب دینے کے بجائے اس نے پوچھا۔ آج کل سونے کا بھاؤ کیا ہے اور ایک کاغذ پر حساب کرنے لگا۔ بھاؤ کو چار سو سے ضرب دے کر پٹ سے تکیے پر گرا اور چھت کو گھورنے لگا۔

اوما نے دہشت زدہ ہو کے اس کی آنکھوں کی ٹھہری ہوئی پتلیوں کو دیکھا۔ ''ہائے رام...کیا ہو گیا ہے تمہیں؟''

موہن اسپرنگ والے گدّے کی طرح اٹھ بیٹھا۔

''اوما...سونا...چار سو تولے سونا...پانچ سیر سونا۔''

اوما نے اپنے لاکٹ کو دیکھا۔ ''تم یہ پانچ تولے سونا بھی ٹھکانے لگانا چاہتے ہو؟''

''پانچ تولے نہیں پاگل کی بچی... پانچ سیر...ذرا سوچو، ہم کتنے امیر ہو جائیں گے۔''

اوما نے اپنا سر پیٹ لیا۔ ''کیا کہیں ڈاکا ڈالنے کا خیال ہے...دماغ چل گیا ہے تمہارا...نہیں بننا مجھے دولت مند...چلو سو جاؤ۔''

لیکن موہن لال نے اسے خواب میں سورگ باشی دادا کی جلوہ نمائی کے بارے میں بتایا۔ ''انہوں نے جو کہا...اس کا ایک ایک لفظ درست تھا...میں نے یہ قصہ بہت سنا ہے...اپنی ماں سے بھی۔''

''پچاس سال پہلے ایسا ہوا ہوگا...لیکن اب اس کا خواب دیکھنا بھی پاگل پن ہے۔''

''کیوں پاگل پن ہے؟...وہ سونا وہیں ہوگا۔''

''لیکن وہ دوسرا ملک ہے...سیکڑوں میل دور...دشمن کا علاقہ ہے...ہم سونا نکالنے جائیں گے تو سونے کی جگہ دفن کر دیے جائیں گے۔''

مگر موہن لال کے دماغ میں سونے کا خیال کینسر کا پھوڑا بن گیا جو نظر نہیں آتا تھا اور اندر ہی اندر پھیلتا جا رہا تھا۔ اس کی سوچ کو مغلوب اور مفلوج کرتا جا رہا تھا...وہ دن رات سوچتا رہا اور دروازے بند کر کے اپنی دھرم پتنی سے اپنا خاندانی خزانہ بازیاب کرنے کا پلان ڈسکس کرتا رہا...اوما اپنے فیصلے میں اٹل رہی۔ ''یہ ناممکن ہے۔''

''ناممکن کچھ نہیں ہوتا۔''

''یہ نپولین کہتا تھا...تم موہن لال ہو۔''

''ہم کوشش ضرور کر سکتے ہیں۔''

''خواہ اس میں جان چلی جائے؟'' اوما نے کہا۔

''جان ایک ہی بار جاتی ہے میری جان...پھر ایسے مر مر کے جینے سے بہتر نہیں ہے کہ ہم جان کی بازی لگا دیں۔

کامیاب رہے تو کروڑپتی ہو جائیں گے۔"

"موہن پیارے... میں ایسا کیوں سوچوں کہ میں بھوکے آدم خور شیر کے سامنے جاکے اسے میرا کا بھجن سناؤں تو وہ میرے قدموں میں سر رکھ دے گا... پھر میں اس پر سواری کروں گی۔"

لیکن موہن نے بالآخر اسے قائل کر لیا۔ اس نے دلائل دیے... پھر قسمیں دیں اور آخر میں دھمکی دی کہ ٹھیک ہے... تم مت جاؤ میرے ساتھ... میں اکیلا ہی جاتا ہوں... یہ زیادہ آسان ہوگا میرے لیے کہ لوٹ کر ہی نہ آؤں' جو اس گھر میں رہتے ہوں گے... انہی کی کسی لڑکی سے نکاح پڑھوا لوں...

اس ایک دھمکی میں اتنی دھمکیاں پوشیدہ تھیں کہ اوما کو ہنسی نہیں آئی... وہ سچ مچ ڈر گئی... زمانہ ایسا ہی ہے... پیسے کے آگے دھرم، ذات کی کوئی حیثیت نہیں رہی... لوگ سارے رشتے توڑ کے سات سمندر پار جاتے ہیں اور پھر کبھی لوٹ کے نہیں آتے... موہن کے دماغ میں بھی لالچ گھس کے بیٹھ گیا ہے... وہ جو کہہ رہا ہے کر بھی سکتا ہے... وہ بنا پیسے کے رہ سکتی تھی، بنا موہن کے نہیں... موہن کے ساتھ مرسکتی تھی، اس کے بغیر نہیں جی سکتی تھی۔

جب ایک بار اوما نے خودکشی کے اس سفر میں موہن کے ساتھ جانے کا فیصلہ کر لیا تو سب کچھ بدل گیا۔ اس کے دماغ نے یوٹرن لیا اور موہن کے ساتھ چلنے لگا۔ پانچ سیر سونا ملنے کی آس پہلے ایک فیصد تھی، اب وہ اس پودے کی طرح بڑھنے لگی جسے بنجر زمین سے نکال کر زرخیز مٹی، کھاد اور پانی فراہم کر دیا جائے۔ وہ دولت مندی کے خوابوں میں موہن کے ساتھ شریک ہوگئی اور رفتہ رفتہ قائل ہونے لگی کہ موہن نے جو سوچا ہے، وہ مشکل ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں۔

وہ دروازے بند کر کے اس مشن ناممکنات کی تفصیلات ڈسکس کرتے رہے اور اپنے منصوبے کی نوک پلک سنوارتے رہے۔ ظاہر ہے انہوں نے پاگل دادا اولے خواب کا کسی سے بھی ذکر نہیں کیا۔ بڑی بھابی تو ایسی ظالم تھی کہ کسی عامل کے ذریعے ان کی روح کو بلوالیتی اور پھر ان سے لڑتی کہ انہوں نے بڑے کو چھوڑ کے خزانے کا راز چھوٹے کو کیوں بتایا؟

انہوں نے اپنے ارادوں کی کسی کو ہوا بھی نہ لگنے دی اور اپنے سفر کے عزائم سے سب کو بے خبر رکھا۔ موہن لال نے بیوی کو سمجھا دیا تھا کہ چار سو تولے سونے کے وارث چار بھائی ہیں لیکن کچھ پتا نہیں دس بہنوئی بھی اپنی بیویوں کو آگے بڑھا دیں کہ یہ باپ کا نہیں، دادا کا مال ہے۔ ہم کس کس کو حصہ دیں گے اور آخر میں ہمارے پاس کیا رہ جائے گا... پانچ سیر میں سے وہی پانچ تولہ...

اوما عورت تھی جو سونے کا عشق اپنی فطرت اور سرشت میں رکھتی ہے... پھر بھابیوں اور نندوں سے عداوت رکھے بغیر بھی گزارہ نہ تھا... یہ خیال اسے بڑی مسرت اور طمانیت دیتا تھا کہ وہ سونے میں پیلی پھرے... دولت صرف اسے باعزت کرے، باقی سب اس سے حسد کرنے والے ہوں۔ چنانچہ اس نے اتنی بڑی بات ہضم کر لی ورنہ اتنا عرصہ وہ راز کو راز رکھتی... دیواروں کو بھی نہ بتاتی جن کے کان ہوتے ہیں... تو بیمار پڑ جاتی... موہن لال احمق تھا جو سمجھ رہا تھا کہ یہ کسی سوگند... قسم... التجا یا دھمکی کا اثر تھا۔

مسائل بہت سے تھے۔ سب سے بڑا مسئلہ بچوں کا تھا۔ انہیں نانا نانی کے گھر میں چھوڑا جاسکتا تھا جہاں ویسے بھی وہ ہر سال گرمی کی چھٹیاں گزارتے تھے۔ ان کا گھر بہت شان دار تھا اور وہاں بچوں کی خوب آؤ بھگت ہوتی تھی۔ چنانچہ وہ ہر سال بڑی بے چینی سے اسکول بند ہونے کا انتظار کرتے تھے۔ ان کے ساتھ اس سال اوما کو نہیں جانا تھا... اس سے بچوں کو قطعی فرق نہیں پڑا تھا لیکن اوما کا دل اس خیال سے بار بار ڈوب جاتا کہ کیا اس جنم میں وہ پھر اپنے بچوں کو دیکھ سکے گی... اس کے بچے بن ماں کے تو نہیں رہ جائیں گے... کیا اس کے وجود کے ان دو ٹکڑوں کی قیمت پانچ سیر سونے سے اتنی کم تھی؟

موہن نے سخت کوشش سے اوما کی امید کا گراف ڈپریشن کی سطح تک نہیں گرنے دیا اور اسے آنے والے اچھے دنوں کے خواب دکھاتا رہا... جب وہ دولت مند ہوں گے تو ان کے بچے چم چم کرتی گاڑی میں جسے باوردی شوفر چلا رہا ہوگا، دہلی کے سب سے اچھے اسکول میں پڑھنے جائیں گے... ابا کی طرح وہ پھر الیکٹرانکس کا خاندانی بزنس شروع کریں گے کہ مزید دولت آئے گی اور ساری دنیا گھومیں گے۔

پاکستان کا ویزا حاصل کرنا سب سے مشکل کام تھا لیکن ایک انتہائی چالاک ایجنٹ نے ناممکن کو بھی ممکن کر کے دکھا دیا۔ یہ معرکہ سر کرنے میں جتنا پیسا خرچ ہوا، وہ موہن کے تصور سے بھی زیادہ تھا مگر اس نے اپنے تمام وسائل استعمال کیے... جہاں سے ادھار مل سکتا تھا، ادھار لیا... جھوٹ بول کے اوما نے میکے والوں سے بیس ہزار حاصل کیے... اس میں سے دس ہزار اس کے بھائی نے امریکا سے بھیجے تھے... راز داری دوسرا مسئلہ تھا لیکن ایک دن آیا کہ وہ آخری جھوٹ بول کے گھر سے نکلے.. انہوں نے کہا کہ وہ گھومنے کے لیے

بمبئی جا رہے ہیں اور دہلی سے لاہور جانے والی دوستی بس سروس میں پاکستان روانہ ہوگئے۔

☆☆☆

رائے بہادر چمن لال کے نام سے آشنا پہلا شخص ایک سفید ریش اور بیمار بوڑھا تھا جو ہڈیوں کا ڈھانچا بنا معذور پڑا تھا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ اس کی عمر سو سال ہے، وہ پہلے پہلوانی کرتا تھا... اور بہ قلم خود چمن لال سے ملا تھا۔

موہن اور اوما کے لیے اس فاتر العقل بوڑھے کی چارپائی کے سامنے دو کرسیاں رکھ دی گئی تھیں۔ مختصر سے گھر میں بڈھے کے ساتھ اس کا پوتا اور پوتے کی بیوی رہتے تھے... پوتا رات گئے دکان بند کر کے لوٹتا تھا۔ اس کی تیس سالہ بیوی بھارت سے آنے والے مہمانوں کے لیے چائے بنانے چلی گئی... اس کے دو بچے دروازے کی اوٹ سے جھانک رہے تھے... چھوٹا والا لڑکا شرارت سے کنپٹی پر انگلی گھما کر پیغام دے رہا تھا کہ پردادا پاگل ہیں۔

''لو جی، میں اور چمن لال دلی گئے۔ پہلے تاج محل دیکھا۔ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر ہم نے حلیم بھی کھایا اور نہاری بھی کھائی۔ تیرا دادا چھپ کے ماس بھی کھا لیتا تھا۔ رات کو چمن لال نے کہا کہ چل گانا سنتے ہیں... لو جی، ہم ایک کوٹھے پر چڑھ گئے... موتی بائی کی ادھر بڑی دھوم تھی... اب کرنا خدا کا یہ ہوا پتر موہن لال... کہ ہم دونوں ہی اس پر مر مٹے... ادھر چمن لال کہے کہ میں اس کے لیے اپنا دھرم چھوڑ دوں گا... میں نے کہا کہ میں اپنا خاندان... معاملہ چھوڑا موتی بائی پر... اس نے کہا کہ مجھے دونوں منظور...''

یہ واقعہ سننے کے بعد موہن لال نے اس بچے کا اعتبار کیا جو انہیں اپنے پردادا کی ذہنی کیفیت پر صحیح رپورٹ دے رہا تھا... اسے اپنے دادا کے بارے میں یہ علم تو نہیں تھا کہ وہ چھپ کر ماس کھاتے تھے یا موتی بائی کے کوٹھے پر گئے تھے لیکن بڈھے کی اسٹوری میں تاج محل کو آگرے سے دہلی شفٹ کر دیا گیا تھا... وہ سب جھوٹ بول رہا تھا... نہ وہ سو سال کا تھا... نہ کبھی پہلوان رہا تھا اور نہ چمن لال سے ذاتی طور پر ملا تھا... جب وہ چائے پی رہے تھے تو بڈھے کی پوت بہو نے بھی کہا۔ ''داداجی کا کچھ پتا نہیں... یہ تو ہر کہانی میں خود کو ڈال دیتے ہیں... ابھی آپ جنگِ عظیم کی بات کرو گے تو یہ کہیں گے کہ میں ہٹلر کے ساتھ تھا۔''

موہن لال مایوس نہیں ہوا... اس کے باپ کو کافی بڈھے جانتے تھے جو اب ستر اسی کے پیٹے میں تھے اور ان کی یادداشت میں تقسیم سے پہلے کے بہت سے واقعات تھے۔

ایک نے لحاظ کیے بغیر روشن لال کو بہت گالیاں دیں اور یہ بتایا کہ وہ کتنا خردماغ... عیاش اور ظالم تھا... غریب مزارعین اور ان کی فیملی کے ساتھ کیا سلوک کرتا تھا اور وہ فرار نہ ہوتا تو اس کا خون پینے کے خواہش مند بہت تھے... ان میں اس کا باپ بھی شامل تھا۔

موہن لال نے بے عزتی ضرور محسوس کی لیکن برا نہیں مانا... دنیا کو کیا پڑی ہے کہ مروت میں شیطان کو اچھا انسان کہے... دوسرے بوڑھے نے بات کو ٹال دیا کہ اب ان کو کیا کہنا جن کی ہڈیاں بھی گل گئیں... ان کی نیکی بدی ان کے ساتھ گئی... روشن لال کی وجہ سے اس گاؤں کے بچوں نے پڑھا اور لوگوں کو علاج کی سہولت میسر آئی... وہ پرائمری اسکول اب ہائی اسکول ہے اور اسپتال سرکاری انتظام میں چل رہا ہے۔

پھر وہ موہن لال اور اس کی بیوی کو اپنے ساتھ اس جگہ لے گیا جہاں روشن لال کی حویلی تھی اور باغ تھا۔ موہن لال نے محسوس کیا کہ جو ان سے ملتے ہیں، یہ جان کے خوش ہوتے ہیں کہ وہ صرف اپنی جنم بھومی دیکھنے کے لیے بھارت سے آیا ہے۔ سب کا اخلاق اچھا تھا۔ سب مہمان نوازی کے جذبات کا بھرپور مظاہرہ کرتے تھے۔ نہ کسی کے رویّے میں عداوت تھی، نہ کسی کے لہجے میں نفرت... چائے لسّی کو پوچھنا تو معمولی بات تھی... لوگ انہیں کھانے پر مدعو کر رہے تھے اور قیام کی پیش کش کر رہے تھے۔

خوف اب اوما کے دل سے بھی نکل گیا تھا۔ اس نے جہاں یہ کہا کہ ہمیں ڈر لگتا ہے، لوگ ہنسنے لگے... ''ہماری آپ سے کیا دشمنی جی۔'' ایک ادھیڑ عمر شخص نے کہا۔ ''ہم خود انڈیا جاتے رہتے ہیں... تین بار اپنی فیملی کے ساتھ خواجہ صاحب کے دربار میں حاضری دے چکا ہوں۔ دہلی اور آگرہ بھی جا چکا ہوں... یہ کوئی سن سینتالیس تھوڑا ہی ہے۔''

ایک جگہ موہن لال کا راہنما رک گیا۔ ''لو پتر! یہ ہے تیرے دادا کی حویلی... اس کے ساتھ ہی باغ تھا۔''

موہن لال نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ''کہاں؟''

''اس کا نقشہ اب وہ نہیں رہا۔'' اس نے سمجھایا۔ ''یہ جو سڑک ہے، بعد میں نکالی گئی تھی۔ سڑک کے پار حویلی تھی۔''

''یہ سب دکانیں حویلی میں تھیں؟''

''نہیں.. یہ جو کونے کی دکان ہے... کالج شو اسٹور... یہ آخری حد تھی، اس کے بعد گلی ہے... آگے کھلی زمین تھی جس پر آبادی بعد میں ہوئی۔ شو اسٹور سے لے کر الٹے ہاتھ پر تنور تک... سمجھ لے آدھا بازار حویلی کے باہر کی جگہ ہے۔''

''اور حویلی؟''
''وہ پیچھے کا حصہ ہے... باغ پر لوگوں نے قبضہ کر کے گھر بنالیے ہیں۔''
''حویلی میں اب کون رہتا ہے؟''
''میرا خیال ہے اوپر والا حصہ بعد میں بنا... نیچے کی جگہ چار گوجر بھائیوں نے پکڑلی تھی... وہ طاقتور تھے اور انہوں نے بعد میں مل ملا کے اسے اپنے نام بھی کرالیا تھا... سب ہو جاتا ہے دنیا میں... اوپر بھی انہی کی اولادیں ہوں گی۔''
''آپ انہیں جانتے ہیں؟''
اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں بعد میں آیا تھا اور بہت دور رہتا ہوں... میری کسی سے جان پہچان نہیں... لیکن میں تمہارے ساتھ چل سکتا ہوں۔''
''آپ کی بڑی مہربانی... ہم خود مل لیں گے۔''
''گیٹ یہ سامنے ہے... جانے سے پہلے ملنا ضرور۔''
خوش اخلاق بوڑھے نے ہاتھ ملایا اور رخصت ہوگیا۔
بڑا سا گیٹ آج بھی وہی تھا۔ اس کے دو پھاٹک تھے۔ ہر پھاٹک دس فٹ اونچا اور چھ فٹ چوڑا تھا۔ مکینوں نے ایک پھاٹک کو مستقل طور پر بند کر دیا تھا۔ دوسرے کے بیچ میں چھوٹا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ شاید بڑا گیٹ کسی گاڑی کے آنے پر کھولا جاتا ہوگا۔
موہن لال ہمت کر کے اندر داخل ہوگیا۔ سڑک پر سے گزرنے والے ان کی طرف ذرا بھی متوجہ نہیں تھے۔ بتائے بغیر کسی کو کیسے یہ علم ہوسکتا تھا کہ وہ بھارت سے آیا ہے اور چمن لال کا پوتا ہے۔ ان کے اور عام لوگوں کی شکل و صورت یا حلیے میں کوئی فرق نہیں تھا۔ ایک مختصر سی ڈیوڑھی یا راہداری سے گزر کے وہ اچانک صحن میں پہنچ گئے جو حویلی کے چار حصوں کے عین درمیان میں پھیلا ہوا تھا۔ اوپر والے چار حصے اسی کے نقشے پر بنائے گئے تھے۔
چاروں طرف آج بھی برآمدہ موجود تھا۔ برآمدے سے صحن میں آنے کے لیے محرابی دروازے بھی موجود تھے۔ ہر برآمدے کی لمبائی کا اندازہ موہن نے تیس چالیس گز کے درمیان کیا... پرانے وقتوں کے حساب سے یہ کافی بڑی حویلی تھی۔ اندر سے اس میں زیادہ تبدیلی نہیں آئی تھی۔
چند بچے جوائنٹوں کے بنے ہوئے صحن میں کرسی رکھ کے ٹینس کی گیند سے کرکٹ کھیل رہے تھے، رک کر ان کی طرف دیکھنے لگے... اوپر والے حصوں میں برآمدے نہیں تھے۔ کمروں کی دیواریں نیچے برآمدے کے محرابی دروازوں کے ستونوں پر اٹھا دی گئی تھیں... اس طرح اوپر والے کمرے بہت بڑے ہوگئے ہوں گے یا ایک کی جگہ دو کمرے بنانے کی گنجائش نکل آئی ہوگی۔ صحن کے اوپر ایک قطار میں ہر طرف تین کھڑکیاں دکھائی دے رہی تھیں... دو کھلی کھڑکیوں سے عورتوں کے متجسس چہرے ان کو تک رہے تھے۔
پھر برآمدے میں جھولنے والی کرسی پر بیٹھا ہوا ایک سفید ریش شخص سیڑھیاں اتر کے ان کی طرف آیا۔ اس کی آنکھوں میں تجسس سے زیادہ غصہ تھا... قریب آکے اس نے بیٹھی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ''ہاں جی... کس سے ملنا ہے؟''
موہن لال نے کہا۔ ''جو بھی اس گھر کا بڑا ہو۔''
وہ غصے سے بولا۔ ''بڑا تو میں بھی ہوں... تمہارے باپ کے برابر ہوں لیکن تم بتاؤ ایسے منہ اٹھا کے اندر کیسے چلے آئے... جب جانتے کسی کو نہیں۔''
موہن نے عاجزی سے کہا۔ ''میں معافی چاہتا ہوں... دروازہ کھلا ہوا تھا اور مجھے باہر کہیں کوئی گھنٹی کا بٹن نظر نہیں آیا۔''
اومانے کہا۔ ''چاچا جی! ہم بڑی دور سے آئے ہیں۔''
موہن نے مسکرا کے کہا۔ ''یہ گھر ہمارا ہے... میرا مطلب ہے پہلے ہم یہاں رہتے تھے۔''
چاچا جی کہنے سے اس کی ناراضی کم نہیں ہوئی۔ ''تم رہتے تھے؟ پچاس سال سے تو میں ہوں یہاں اور تمہاری عمر مجھے اس سے آدھی بھی نہیں لگتی...''
''میں اس سے بھی پہلے کی بات کر رہا تھا... جب میرے بڑے یہاں رہتے تھے... تقسیم سے بھی پہلے۔''
ان الفاظ کا اثر بجلی کے کرنٹ جیسا ہوا۔ وہ شخص بے اختیار پیچھے ہٹ گیا۔ ''کون ہو تم؟''
ایک نوجوان نے قریب آکے کہا۔ ''کیا ہوا نانا جی؟''
''اوئے، اس کو دیکھ... سیدھا اندر آگیا اور اب کہتا ہے کہ یہاں میرے بڑے رہتے تھے... پاکستان بننے سے پہلے...''
نوجوان بھی تیس سال کے لگ بھگ اور موہن کا ہم عمر ہی تھا۔ اس نے لٹھے کی کھڑکھڑ کرتی سفید شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔
''میرا نام موہن لال ہے... اور یہ میری دھرم پتنی ہے... اومادیوی... ہم دہلی سے آئے ہیں۔'' اس نے دوستانہ انداز میں اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔
اس کے چہرے پر خوش گوار حیرت پھیل گئی۔ ''میرا نام نواب دین ہے... یہ میرے نانا ہیں بشیر علی...''
اس وقت تک متعدد کھڑکیوں سے عورتوں، بچوں کے چہرے باہر جھانکنے لگے تھے۔ پیچھے برآمدے سے اتر کے تین

چار مختلف عمروں کے مرد ان کی طرف بڑھ رہے تھے... کرکٹ کھیلنے والے بچے ان کے گرد جمع ہو گئے تھے۔

موہن لال نے کہا۔ ''یہ حویلی میرے دادا رائے بہادر چمن لال نے بنوائی تھی۔''

نواب دین نے اس سے ہاتھ ملایا۔ ''اچھا اچھا... یہ تو بہت پرانی بات ہے... میری پیدائش سے بھی پہلے... نانا آپ کو یاد ہے؟''

''کیوں نہیں یاد... اس وقت میں چودہ سال کا تھا... لیکن ابھی تک انہوں نے بتایا نہیں کہ یہ کیوں آئے ہیں... حویلی واپس لینے؟''

موہن لال ہنسا۔ ''ہاں جی... اسے سوٹ کیس میں ڈال کے دہلی لے جانے کا خیال ہے۔''

نواب دین نے کہا۔ ''آؤ... اندر آؤ... گھر کے بڑے بڑے نانا ہیں... انہیں نظر تو کم آتا ہے لیکن یاد سب ہے۔''

یہ خبر تیزی سے حویلی کے ایک گوشے سے دوسرے کنارے تک پھیل گئی کہ حویلی کے پرانے مالک سرحد پار سے آئے ہیں... یہ سوال خود بخود ذہنوں اور زبانوں پر آیا ہوگا کہ کیوں آئے ہیں... ممکن ہے کچھ کم عقل اور زیادہ عمر کی خواتین تشویش کا شکار بھی ہوئی ہوں۔

انہیں ایک صاف ستھرے مہمان خانے میں بٹھا دیا گیا۔ موہن لال کے لیے یہ احساس ہی بہت عجیب تھا کہ وہ اس ہوا میں سانس لے رہا ہے اور اس ماحول کو دیکھ رہا ہے جس میں اس کے پرکھوں کی تین نسلوں نے اپنا اپنا وقت گزارا تھا... قدیم دیواروں کے درمیان اسے ہر طرف سے ان کی آنکھیں محبت سے دیکھتی نظر آ رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں سوال تھے اور آنسو تھے۔ خود موہن لال کو یہ فضا سخت جذباتی کر رہی تھی۔

کشادہ کمرے میں پرانے صوفے اور بید کی کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ ایک ایک کر کے مختلف عمروں کے بہت سے نوجوان اندر آنے لگے۔ وہ موہن لال سے ہاتھ ملاتے تھے اور اسے یوں دیکھتے ہوئے چلے جاتے تھے جیسے وہ کوئی عجیب و غریب خلائی مخلوق ہو... دروازوں کی اوٹ سے جھانکنے والے بچوں کے بھی ایسے ہی تاثرات تھے... انڈیا سے آئے ہیں... ہندو ہیں... ایسے ہوتے ہیں ہندو؟... پھر کیسے ہوتے ہیں؟... موہن لال کے کانوں تک ان کے سوال جواب پہنچتے رہے۔

نواب دین کسی کا چاچا تھا تو کسی کا ماموں۔ اب اس کا رویہ بالکل بدل گیا تھا۔ وہ خود بڑی مسرت سے نوجوانوں کو بتا رہا تھا کہ یہ حویلی کے اصل مالکوں کے پوتے ہیں... بھارت سے آئے ہیں... موہن لال کو اس تعارف کے بعد کسی کے چہرے پر ناپسندیدگی کے آثار محسوس نہیں ہوئے... وہ خوشی سے زیادہ حیرت کا اظہار کرتے تھے اور بڑی گرم جوشی سے ملتے تھے... یہ نہ جانے کتنی بار کہا گیا کہ حویلی اب بھی آپ کی ہی ہے... انتظار اب گھر کے سب سے بڑے کا تھا جو نواب دین کے بڑے نانا اور بشیر کے سب سے بڑے بھائی تھے۔ درمیان والے دو تینوں کے بارے میں بتایا گیا کہ گزر چکے ہیں...

بڑے نانا اور بڑے دادا کہلانے والے بلاشبہ ان تمام عہدوں پر فائز رہنے کے مستحق تھے... وہ دھوتی باندھے کھدر کا سلیٹی کرتہ پہنے اور خمیدہ کمر کے ساتھ لاٹھی ٹیکتا آیا تو کمرے میں چاروں طرف بیٹھ کے موہن اور اس کی بیوی کو کسی عجیب مخلوق کی طرح ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے والے کھڑے ہو گئے مگر سفید داڑھی اور سفید بھوؤں والے اس شخص نے پروا نہیں کی۔ وہ احترام کے اس مظاہرے کا عادی تھا... سر پر کروشیا کی بنی ٹوپی کو ڈھکن کی طرح لگانے اور آنکھوں پر ہاتھ رکھے وہ موہن کے بالکل سامنے آ کے رک گیا۔ صرف دو فٹ کے فاصلے سے اس نے موہن کا اور پھر اوما کا جائزہ لیا... صاف نظر آتا تھا کہ اس کی نظر کمزور ہے۔

''کون ہے بھئی تو...؟'' اس نے بالآخر اپنی کانپتی آواز میں کہا۔

چھوٹے بھائی نے اس کے لیے ایک کرسی قریب کر دی اور موہن لال کے بارے میں تفصیل سے کان میں بتایا... وہ سر ہلاتا رہا... نواب دین نے اس کا نام اشرف علی بتا کے وقتی طور پر معاملات سے علیحدگی اختیار کی۔

اب اشرف کے ردِ عمل کا سب کو انتظار تھا۔ آنے والے بھارتی تھے۔ ہندو تھے یا صرف مہمان تھے... ان کے اسٹیٹس یا حیثیت کا فیصلہ ہو جانے پر ہی ان کے ساتھ ہونے والے سلوک کا انحصار تھا۔ فی الحال ردِ عمل ملا جلا تھا اور ایک طرح سے فیصلہ چیف جسٹس صاحب کے زیرِ غور تھا۔

اشرف علی کے چہرے پر کسی قسم کا تاثر نہیں تھا۔ خاندان کا سربراہ پرانے وقتوں کا مردم شناس اور جہاں دیدہ شخص تھا۔ موہن کو یقین تھا کہ پرانے لوگوں کی طرح اس کے دل میں وسعت اور نگاہ میں مروت ہوگی... یہ الگ بات تھی کہ وہ موہن کی نیت پر شک کرے اور خوامخواہ فرض کرے کہ وہ حویلی کا پرانا اور اصل دعوے دار بن کے انہیں بے دخل کرنے آیا ہے۔

اچانک اشرف کے چہرے پر ایک نرم مسکراہٹ کا اجالا پھیلا... اس نے فیصلہ ساعت مکمل ہونے تک ملتوی کر

جب وہ گھر کی خواتین سے ملے تو مزید حیران ہوئے... نوجوان لڑکیوں کے فیشن وہی تھے جو دہلی کے...

موہن اور اوما کے قیام کے لیے ایک کمرا خالی کر دیا گیا جو نہ جانے کس کا بیڈ روم تھا۔ اس میں ایک شادی کے جہیز والی مسہری تھی۔ کپڑوں کی الماری مقفل تھی لیکن پرانی ڈریسنگ ٹیبل پر تمام سامان ویسے ہی چھوڑ دیا گیا تھا... یہاں ابھی اٹیچ باتھ نہیں بنے تھے۔ انہیں بتا دیا گیا کہ ضرورت پڑنے پر وہ کون سے غسل خانے کو استعمال کر سکتے ہیں۔ یہ غسل خانہ کمرے کے باہر برآمدے کے آخری حصے میں تھا اور ہر برآمدے کے آخر میں زینے کے ساتھ بنا دیا گیا تھا۔

کھانے سے پہلے موہن لال کو بزرگ خواتین کے سامنے پیش کیا گیا۔ ان میں سے ایک نابینا تھی اور دوسری چلنے پھرنے سے معذور... انہوں نے موہن کے سر پر ہاتھ پھیر کے دعا دی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ موہن کا ان سے تعارف اوما نے کرایا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ خود وہ پہلے ہی سب سے مل کے ان کی دعائیں لے چکی تھی اور اسے یاد بھی ہوگیا تھا کہ کون کیا ہے... رشتوں کے معاملے میں خواتین کی یادداشت یقیناً کارکردگی کے اعلیٰ معیار پر پوری اترتی ہے۔

نسبتاً کم عمر... خود کو جوان سمجھنے والی... جوان اور نوجوان خواتین سے تعارف تو نہیں کرایا گیا لیکن موہن لال نے ہر جگہ انہیں آتے جاتے دیکھا۔ وہ سر پر دوپٹا ڈھانپے اس بھارتی جوڑے کو کن انکھیوں سے دیکھتی تھیں جو گویا اسٹار پلس کے ڈراموں سے نکل کے ان کے گھر میں پہنچ گیا تھا۔ وہ سب پردے دار خواتین تھیں اور ان کے مرد زیادہ تر نمازی تھے۔ عشا کی آواز پر بیشتر مرد غائب ہوگئے۔ دو چار نے گھر میں ہی نماز پڑھی تھی... لیکن موہن لال اور اوما کو گھر کے بچے ہونے کا سرکاری سرٹیفکیٹ جاری ہونے کے بعد گویا سارے تکلفات اٹھ گئے۔

ابھی تک موہن کا پلان توقعات کے مطابق کامیابی کی جانب گامزن تھا تاہم اسے حیرانی یہ تھی کہ اس گھر میں بچے سے بوڑھے تک سب غیر متعصب اور خوش اخلاق اور مہمان نواز کیسے تھے؟ یہ فیملی ڈسپلن تھا... عادت اور فطرت تھی یا واقعی پرانی نفرتوں کا الاؤ بجھ چکا تھا اور دشمنی کے جذبات کو زندہ رکھنے کی کوشش محض ایک سیاسی ناٹک تھا جو میڈیا پر چلتا تھا... ورنہ یہاں بھی لوگ امیتابھ اور شاہ رخ کے دیوانے تھے۔ بالکل اسی طرح جیسے اس کا باپ مہدی حسن کی غزلوں پر سر دھنتا تھا اور دادا نور جہاں کا عاشق رہا تھا۔

باتوں اور سوال جواب کا سلسلہ تو شاید ساری رات چلتا لیکن پہلے بچے لڑھکے یا لڑھکا دیے گئے کیونکہ انہیں صبح اسکول جانا تھا... پھر ان کی مائیں جماہیاں لیتی اٹھیں... بالآخر اشرف علی نے اعلان کر دیا کہ چلو بھئی، مہمان تھکے ہوئے ہیں... انہیں سونے دو... باقی کل...

تنہائی میسر آتے ہی موہن نے اوما کو لپٹا لیا۔ ''یہ تو کمال ہوگیا اوما... ایسے سواگت کی مجھے امید نہیں تھی۔''

اوما گھٹنوں پر ٹھوڑی رکھ کے بیٹھ گئی۔ وہ کسی سوچ میں گم تھی۔

''کیا بات ہے... تم خوش نہیں ہو؟''

''یہ بڑے اچھے لوگ ہیں موہن... نیک دل اور بھروسا کرنے والے... اور ہم کیا کرنے آئے ہیں؟ ان کو دھوکے سے لوٹنے...؟''

موہن نے ضبط سے کام لیا۔ ''نہیں ڈارلنگ... ہم اس گھر میں رہنے والوں کی پھوٹی کوڑی بھی نہیں لے جائیں گے۔ ہم وہی لے جائیں گے جو ہمارا ہے۔''

''اونہہ... یہ بات ہے تو انہیں بتا دو.. وہ خود کب تمہارا مال رکھیں گے... حقیقت یہ ہے کہ اس پر اب ہمارا کوئی قانونی حق نہیں۔''

''اخلاقی تو ہے... وہ ہمارے باپ دادا کی جائز کمائی سے خریدا گیا سونا تھا... انہوں نے کہیں ڈاکا ڈال کے حاصل نہیں کیا تھا... اور اب یہ بحث چھیڑنے کا فائدہ؟ تم جذباتی ہو گئی ہو... اتنا لمبا سفر ہم نے کس لیے کیا تھا؟ ہم سے بڑا بے وقوف کون ہوگا کہ اتنے خطرات اور مشکلات سے گزر کے یہاں تک پہنچنے کے بعد ہم خالی ہاتھ لوٹ جائیں۔'' موہن بگڑ گیا۔

''میں ایسا تو نہیں کہہ رہی۔''

''اپنا اور میرا دماغ خراب مت کرو... قسمت ہمارا ساتھ نہ دے رہی ہوتی تو ہمیں اتنی پذیرائی نہ ملتی۔''

''اس کام میں کتنے دن لگ جائیں گے موہن؟''

''یہ میں کیسے بتاؤں؟ لیکن ہاں... کام بہت آسان ہو گیا ہے... دو چار دن میں ہو جانا چاہیے... ہم چاہیں تو دس دن یہاں رہیں... انہیں اعتراض نہیں ہوگا... لیکن میں خود اتنے دن لگانا نہیں چاہتا۔''

''مجھے یہاں آکے بڑا عجیب سا لگ رہا ہے۔'' اوما لیٹ گئی۔

''تمہیں کیا عجیب لگا؟'' موہن لائٹ آف کر کے اس کے ساتھ لیٹ گیا۔

''یہ تو بالکل اندھیرا ہوگیا'' اوما اس سے چمٹ گئی۔

''تمہیں ڈر لگ رہا ہے؟'' موہن ہنسا۔ ''یہاں زیرو واٹ کا کوئی بلب نہیں ہے۔''
''اچھا تو لائٹ جلا دو۔''
''مجھے روشنی میں نیند نہیں آتی... تم جانتی ہو۔''
''بجھا دینا سوتے وقت۔''
موہن نے سوئچ آن کر دیا۔ ''اندھیرے میں تمہیں آتمائیں بھٹکتی دکھائی دیتی ہیں... پرکھوں کی؟''
''تم نے دیکھا موہن... یہ لوگ کیسے رہتے ہیں... جو بڑا ہے اس کا حکم چلتا ہے... جوائنٹ فیملی سسٹم سے کسی کو شکایت نہیں۔''
''شکایت ہو گی... بغاوت ابھی کسی نے نہیں کی یا ہمارے سامنے سب اچھا اچھا پیش کر رہے ہیں۔''
''تمہارا مطلب ہے ناٹک کر رہے ہیں؟''
''نہیں... یہ ٹھیک بھی ہو سکتا ہے لیکن اوما ڈیئر... یہ مت بھولو کہ تم گاؤں میں ہو۔ دہلی جیسے ہر شہر کے مسائل وہی ہوں گے... کراچی یا لاہور میں جوائنٹ فیملی سسٹم ایسے ہرگز نہیں چل سکتا۔''
اوما سوچتے ہوئے بولی۔ ''ہم نے تو کوشش ہی نہیں کی۔''
''ہم بھی رہتے تو ہیں ایک ساتھ۔'' اس نے کہا۔
''جیسے قیدی رہتے ہیں... جائیں تو جائیں کہاں... کوئی کسی کے گھریلو معاملات میں حکم چلا کے دکھائے... ہر ایک اپنی کرتا ہے... ہم کیا سب کے بیچ میں ایسے رہ سکتے ہیں؟''
موہن نے بات ٹالی۔ ''بات یہ ہے اوما ڈیئر! بھگوان نے سب کی تقدیر جدا بنائی ہے... جو زیادہ ذہین ہے... زیادہ محنتی ہے... وہ ترقی کیوں نہ کرے؟ زیادہ کیوں نہ کمائے... اور کمائے تو فائدہ اس کے بچوں کو کیوں نہ ملے... سب کی طرح وہ خراب حال میں کیوں رہے۔''
لیکن اوما نہ جانے کب سو گئی تھی۔ یہ فرق موہن نے ہر جگہ ایسے ہی دیکھا تھا۔ مرد مشکل سے سوتے تھے... عورتوں کے ہاتھ میں تو جیسے کوئی سوئچ تھا۔ آف کیا اور غائب... موہن کی نیند اس رات بہت ڈسٹرب ہوئی۔ خود اوما بار بار چونکتی رہی... نتیجتاً یہ کہ صبح وہ دیر سے جاگے... وہ کمرے سے باہر آئے تو حویلی میں غیر معمولی خاموشی تھی۔ مرد کام پر چلے گئے تھے... بچے اسکول اور کالج... عورتیں گھر کے کاموں میں مصروف تھیں اور دونوں بوڑھے بھائی اشرف علی اور بشیر علی برآمدے میں مونڈھے ڈالے حقے گڑگڑا رہے تھے۔
ابھی وہ کسی بھابی کے ہاتھ کے دیسی گھی والے گرم گرم پراٹھے، دیسی مکھن اور گھی میں تر تراتے حلوے سے کھا رہے تھے کہ نیچے سے بلاوا آ گیا... اوپر نیچے دو باورچی خانے کی ذمے داری تمام بہوئیں یا بہوؤں کی بہوئیں مل جل کے باری باری سنبھالتی تھیں... گھر میں ایک ایسی تقسیم کار تھی جو کسی رکاوٹ کے بغیر چلتی رہتی تھی۔
اشرف علی کے پاس کوئی وردی والا تھانے دار بیٹھا تھا۔ اس نے غور سے موہن لال اور اوما کو دیکھا۔ ''تم آئے ہو دلی سے؟''
موہن نے سر ہلایا۔ ''ہم کل ہی پہنچے تھے۔''
''تم نے قانون کے مطابق تھانے میں رپورٹ نہیں کی؟''
اشرف علی نے کہا۔ ''اوئے، اب زیادہ تھانے دار نہ بن... یہ مہمان ہیں ہمارے... جو لکھنا ہے لکھ لے۔'' پھر اس نے اوما کو ڈانٹا۔ ''تو کیوں کھڑی ہے... جا اندر۔''
تھانے دار نے معذرت کی۔ ''کارروائی تو ڈالنی پڑتی ہے چودھری صاحب...'' موہن نے اپنے پاسپورٹ پیش کیے... تھانے دار نے ضابطے کے مطابق ان کا اندراج کیا۔
''مقصد کیا لکھوں؟''
''جو تجھے ٹھیک لگے خود ہی لکھ لے... بعد میں کوئی مسئلہ کھڑا کیا نہ تو وردی کا لحاظ نہیں کرنا میں نے۔''
تھانے دار کھسیانا ہو گیا۔ ''آپ بھی حد کرتے ہو جی۔''
اشرف علی نے اس کی نہیں سنی۔ ''لے بھئی پتر موہن لال... یہ جو تھانے دار ہے نا... اس کو میرے... وڈے بیٹے نے پڑھایا ہے... بڑے ڈنڈے کھڑکائے ہیں اس کو... ابھی تک ہوں گے نشان... اور وہ جو اس کا باپ تھا...''
تھانے دار شربت کا گلاس حلق میں انڈیل کے کھڑا ہو گیا۔ ''آپ بھی کوئی موقع نہیں جانے دیتے۔''
اشرف علی نے تھانے دار کی ایسی تیسی اس کے جانے کے بعد بھی جاری رکھی۔ موہن لال سخت متاثر ہوا۔ اس نے یہ تو سنا تھا کہ ان کی آبائی حویلی پر قبضہ کرنے والے ڈاڈے لوگ تھے... طاقتور... اس کا مطلب بدمعاش بھی ہو سکتا تھا... دولت مند بھی اور بااثر بھی... موہن لال دیکھ رہا تھا کہ وہ آج بھی ڈاڈے ہیں۔
ایسے لوگ موہن لال اور اوما کو غائب کر بھی سکتے تھے اور کرا بھی سکتے تھے... جاسوسی کرنے کے الزام میں گرفتار بھی کرا سکتے تھے اور مروا بھی سکتے تھے... کھایا پیا کچھ نہیں، گلاس توڑا بارہ آنے... ان کے گھر والے کیا جانیں وہ کہاں ہیں... سال بھر بعد سب نام بھی بھول جائیں گے... ابھی پانچ سیر سونا کہاں...

☆☆☆

ایک پورا دن حویلی کے اندر ہی تاریخ کے آثار دیکھتے گزر گیا۔ اشرف علی اور بشیر علی انہیں بتاتے رہے کہ جب حویلی انہوں نے خریدی تو انہیں اندر کیا کچھ ملا تھا اور اس میں سے کیا ابھی تک موجود تھا... یہ بات موہن لال کو عجیب نہیں لگی کہ وہ حویلی ''خریدنے'' کی بات کر رہے تھے۔ ان کی جگہ وہ خود بھی ہوتا تو یہ کیوں تسلیم کرتا کہ اس نے زور زبردستی سے حویلی پر قبضہ کیا تھا۔

یہ مسہری یہاں.... دوسرے کمرے میں تھی.... وہ سنگھار میز تھی... وہ بڑا صندوق تھا جس میں رضائیاں، کمبل بھرے ہوئے تھے... ظاہر ہے پچاس سال بعد پرانے کیسے ہو سکتے ہیں، پھٹ کے ختم ہوئے... فرنیچر بھی زیادہ نہیں بچا تھا لیکن پرانے شیشم کی لکڑی تھی اس لیے ہر کمرے میں ایک مسہری اب بھی استعمال ہو رہی تھی۔

موہن لال نے پوچھا۔ ''نانا جی! آپ کا آنا جانا تھا؟''

''آنا جانا کیوں نہیں تھا... تیرا دادا ذرا ڈرپوک تھا... کوئی خطرہ محسوس کرتا تھا تو مجھے بلا لیتا... میری بڑی دھاک بیٹھی ہوئی تھی... چھوٹے موٹے بدمعاش میرے نام سے کانپتے تھے۔''

'کیونکہ آپ بہت بڑے بدمعاش تھے'... موہن لال نے سوچا۔ 'مگر نہ میں ایسا کہہ سکتا ہوں اور نہ آپ یہ مان سکتے ہیں۔'

''آپ کو کچھ علم ہے... میرے دادا کا کمرا کون سا تھا؟''

''کیوں نہیں... ہندوؤں کے گھر میں وہ پردہ تو نہیں تھا جو مسلمان گھرانوں میں ہوتا تھا... لیکن اپنے پرائے کا فرق اتنا ہی تھا... غیر مرد حویلی میں نہیں آسکتے تھے اور ہندو عورتیں گھونگھٹ نکالتی تھیں... گھر میں بھی جیٹھ اور سسر کے سامنے... جب حویلی ہم نے خریدی تو سامان جوں کا توں تھا۔''

''میں نے سنا تھا... حویلی کو آگ لگا دی گئی تھی؟''

اشرف علی نے نفی میں سر ہلایا۔ ''چمن لال کو ڈرا کے بھگانے کے لیے ایسی بات کہی گئی ہو گی۔ گاؤں کا کوئی بندہ لوٹ مار میں شریک بھی نہیں ہوا... باہر سے کچھ لوگ آئے تھے، تیرے دادا نے مجھے حفاظت کے لیے بلایا تھا لیکن اس نے بھاگنے میں بڑی جلدی کی... مجھے پہنچنے میں کچھ دیر ہو گئی... لیکن حملہ آوروں کو میں نے للکار کے بھگا دیا تھا۔''

''سامان آپ کو صحیح سلامت مل گیا تھا؟''

''ہاں..... اسی سے اندازہ ہوا کہ تیرے دادا کا یہ کمرا تھا... جس میں ہم کھڑے ہیں۔''

موہن لال دم بخود رہ گیا۔ ''یہ...''

''ہاں... چمن لال کی ایک تصویر بھی نہیں ورنہ میں دکھاتا... اس کے کپڑے تھے الماری میں۔ چھڑی تھی... کچھ کاغذات تھے... عورتوں کے کپڑے تو ایک جیسے ہی ہوتے تھے اور عورتیں ہی پہچانتی ہوں گی۔''

موہن لال نے کسی سحر زدہ شخص کی اداکاری دکھائی۔

''یہاں اس کمرے میں رہتے تھے میرے دادا جی اور میری دادی... اوما... تم نے سنا...''

اوما نے سر ہلایا۔ ''یہ سب کتنا عجیب لگ رہا ہے۔''

''میرے ابا بھی یہاں پیدا ہوئے ہوں گے... روشن لال... اسی مسہری پر...'' موہن لال نے آہستہ آہستہ بھاری بھرکم مسہری کے سرہانے پر ہاتھ پھیرا... شیشم کی لکڑی کی پالش خراب ہو کے سیاہ پڑ گئی تھی۔ سرہانے کے وسط میں نصب ایک فٹ اونچا اور چھ انچ چوڑا آئینہ دھندلا گیا تھا... اس کے قدیم بیل بوٹوں میں گرد بھر گئی تھی۔

موہن لال مسہری پر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو لانے کی کوشش کامیاب رہی... اوما کو بھی اپنی ہنسی روک کے چہرہ اداس کرنا پڑا... اشرف علی پر اس جذباتی ڈرامے کا بہت اچھا اثر ہوا... وہ خود بھی جذباتی ہو گیا۔ کاش! اس کے اپنے پوتے بھی اس سے اتنی ہی محبت کرتے۔

''نانا جی! ہم دو چار دن یا جب تک یہاں ہیں... ہمیں اس کمرے میں ٹھہرنے دیا جائے۔''

اب اوما نے اس سین میں اپنے ڈائیلاگ بولے۔

''بات یہ ہے نانا جی! موہن اپنے دادا کا سب سے لاڈلا پوتا تھا... اسے وہ ہر وقت گود میں یا کندھوں پر اٹھائے پھرتے تھے... اس کی ہر فرمائش پوری کی جاتی تھی۔ کوئی اسے غصے کی نظر سے دیکھ نہیں سکتا تھا... جب ان کا دیہانت ہوا تو یہ پاگل ہو گیا... ہر وقت روتا رہتا... ان کے کمرے سے نہیں نکلتا تھا۔''

اشرف علی کیسے ناک آؤٹ نہ ہوتا... اس نے کہا۔

''لے، بس اتنی سی بات ہے، میں یہاں... اکیلا رہتا ہوں... گھر والی کو گزرے بارہ سال ہو گئے... مجھے پتا ہے کسی کی یاد کس طرح دل کا خون کرتی ہے۔''

''نہیں نہیں... میں یہ نہیں کر سکتا... میں نے بڑی غلطی کی کہ آپ سے ایسی درخواست کر دی۔''

''او پتر... کوئی بات نہیں... میں اکیلی ذات... کہیں بھی سو جاؤں گا۔ ایک بھائی اپنی بیوی کے ساتھ تھا تو اسے یہاں ڈر لگتا تھا... کہتی تھی رات کو چمن لال کی بیوی نظر آتی ہے... اس کی روح کہتی ہے کہ میری جگہ کیوں سو رہی ہے... وہ کسی دن سوتے میں میرا گلا دبا دے گی۔''

"میری دادی کی روح؟"

"ہاں... کہتے ہیں... چمن لال ایک بار کسی عورت کے چکر میں پڑ گیا تھا... تیری دادی نے پکڑ لیا... اسی چارپائی پر... اس کا گلا گھونٹ دیا تھا... جھوٹ سچ کا مجھے پتا نہیں... میں ابھی تمہارا سامان یہاں رکھوا دیتا ہوں... یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں... تمہارا گھر ہے... جہاں چاہو رہو۔"

موہن نے سر جھکا کے کہا۔ "آپ کا بہت بڑا دل ہے ناناجی۔"

بار بار نانا کہنا بھی اسپرین کے اشتہار کی طرح اثر کرتا تھا... سر درد کا سن سن کے سر کا درد ہو جاتا ہے۔ اچھا یا برا پروپیگنڈا آہستہ آہستہ ذہن کو متاثر کرتا رہتا ہے۔

یہ موہن لال کے لیے آئیڈیل صورتِ حال تھی... اس نے اپنی عمر کے دو نوجوانوں کو ساتھ لے کر رات کے وقت ایک ایڈونچر کیا۔ وہ پرانی حویلی کے باغ میں کود گئے... اندر تاریکی تھی، ویرانی اور سنسان... جہاں کبھی گھاس یا پھولوں کے گملے ہوں گے، وہاں اب جھاڑ جھنکاڑ پھیلا ہوا تھا... درمیان کے درخت صاف کر دیے گئے تھے۔ دو چار پرانے درخت عہدِ رفتہ کے باغ کی یادگار رہ گئے تھے۔

ان میں سے ایک غلام علی نے شہر سے بی اے کر لیا تھا اور کئی سال سے بے روزگار پھر رہا تھا۔ ابتدا میں ہی اس نے موہن لال کو بتا دیا کہ محبت تو اسے کئی بار ہوئی جو سچی تھی لیکن بڑے اس کو زبردستی ایک کزن سے نتھی کرنے پر تلے بیٹھے تھے۔ انہوں نے ایسا کیا تو وہ بھاگ کے لاہور چلا جائے گا۔ وہ باڈی بلڈنگ کرتا تھا اور دو چار ڈراموں میں بھی کام کر چکا تھا... فلم انڈسٹری تباہ نہ ہوتی تو اس کے لیے بڑا چانس تھا... ٹی وی کی ایک پروڈیوسر جو عمر میں اس سے بارہ سال بڑی اور تین بار کی طلاق یافتہ تھی، اس سے شادی کرنے کے لیے دیوانی ہو رہی تھی لیکن وہ سوچ رہا تھا کہ لاہور کی کسی اچھی بزنس مین فیملی یا کسی اعلیٰ فوجی افسر کی بیٹی پھنس جائے تو اس کا مستقبل سنور جائے... صورت شکل یا عمر کی اسے زیادہ پروا نہیں... موٹی، کالی یہاں تک کہ تھوڑی بہت ذہنی معذور کو بھی وہ فی الحال قبول کر سکتا ہے... ایک بار اپنے قدم جم جائیں تو اسے چھوڑنا کیا مشکل ہوگا... امید ہے اس کا یہ پلان کامیاب ہوگا کیونکہ اس کی اتنی اچھی باڈی ہے اور صورت بھی بری نہیں۔

موہن لال نے اسے چن لیا۔ وہ اس کے مطلب کا آدمی تھا... دوسرا اس کا کزن عبدالرشید بالکل ہی احمق تھا۔ اس نے میٹرک میں فیل ہونے کے بعد تعلیم چھوڑ دی تھی۔ عقل کے ساتھ وہ شکل کا بھی گیا گزرا تھا۔ وہ خیالی پلاؤ پکانے اور ہوائی قلعے تعمیر کرنے کا شوقین تھا۔ اپنے پریکٹیکل اور چالاک کزن کے مقابلے میں وہ تقدیر کی لاٹری پر انحصار کرنے کا شوقین تھا۔ کوئی ایک کروڑ والا پرائز بانڈ نکل آئے۔ کہیں کوئی پیر صاحب تھے جو چالیس دن کا عمل بتاتے تھے.. عمل مشکل تھا لیکن جو کر لے، اسے خواب میں مدفون خزانے کا پتا مل جاتا تھا... ایک دوست نے بتایا تھا کہ گلگت میں سونا نکلتا ہے... وہاں حکومت کا گولڈ پروجیکٹ بھی ہے اور اس کا ڈائریکٹر کوئی محمد اعظم قریشی ہے جو باہر کا پڑھا ہوا ہے... اس کے پاس سونا بنانے کا فارمولا ہے۔

یہ شخص بھی موہن لال کے مطلب کا تھا۔ دونوں کے مزاج اور فطرت میں لالچ کا عنصر غالب تھا۔ ایک اس کے لیے غیر اخلاقی یا جرائم کی راہ بھی اختیار کر سکتا تھا۔ دوسرا کم ہمت تھا اور غیبی امداد پر بھروسا کرتا تھا۔ کام دونوں سے لیا جا سکتا تھا۔

اس رات وہ اپنے دادا کے کمرے میں سوئے جو حویلی کا بانی اور مالک تھا۔ دن اوما کا بھی اچھا گزرا تھا۔ اس نے سب سے رشتے قائم کر لیے تھے۔ کوئی چاچی تھی، کوئی دادی، کوئی بھابی تو کوئی باجی... وہ سب اوما سے بھارت سے زیادہ بھارتی ایکٹروں اور ایکٹرسوں کے بارے میں پوچھتی رہتیں... کبھی بمبئی گئی ہو؟ شاہ رخ سے ملی ہو... اوما ساس بھی کبھی بہو تھی میں مرکزی کردار کرنے والی سے مل چکی تھی... درحقیقت وہ اوما کی فرسٹ کزن تھی... دونوں نے بچپن میں ایک ہی اسکول میں پڑھا تھا... یہ خبر انتہائی سنسنی خیز ثابت ہوئی تھی۔

اوما نے سب کی تعریف کی۔ "اچھے لوگ ہیں لیکن مذہب کے معاملے میں متعصب ہیں۔"

"یہ تم نے کیسے جان لیا؟"

اوما نے کہا۔ "لو... تم نے دیکھا نہیں... ہمارے کھانے پینے کے برتن الگ ہیں... وہ ہمارے ساتھ ضرور بیٹھتے ہیں مگر ان برتنوں میں نہیں کھاتے... میرا تو خیال ہے، بعد میں وہ برتن توڑ دیں گے... پرانی بڑھیاں تو صاف کہتی ہیں کہ غیر مسلموں کے ساتھ ایک ہی برتن میں کھانے سے منع کیا گیا ہے۔"

موہن نے کہا۔ "آج جو نوجوان میرے ساتھ تھے، انہوں نے اسی بوتل سے پانی پی لیا تھا جس سے میں نے پیا تھا... یہ تمہارا وہم ہوگا۔"

"وہم کیسا... کیا ہم کسی مسلمان کو اپنی رسوئی میں گھسنے دیں گے؟ تم تو ماس بھی کھا لیتے ہو... کیسے مزے لے لے کر

جعلی لیٹر ہیڈ پر منگوایا تھا... کمپنی نے اسے یہ آلہ جرمنی سے منگوا کے دیا تھا۔ اس کی قیمت بہت زیادہ تھی اور موہن کو ڈالرز میں ادا کرنا پڑی تھی... اس کے لیے ڈالر بھی اس نے بلیک مارکیٹ سے خریدے تھے لیکن یہ چھوٹا سا آلہ بھی اس کی کامیابی کا ضامن ہوسکتا تھا۔

موہن نے محسوس کیا کہ اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ رہے ہیں۔ اوما بستر پر سیدھی بیٹھی اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے اسے دیکھ رہی تھی۔ یہ ان کی قسمت کا فیصلہ کن لمحہ تھا... چند منٹ میں انہیں معلوم ہونے والا تھا کہ انہوں نے جو رسک لیا اور جو محنت کی، وہ بے مقصد نہیں تھی۔

یہ آلہ ماہرینِ ارضیات زیرِ زمین معدنیات کا سراغ لگانے کے لیے استعمال کرتے ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ ایسے آلات ایجاد ہو چکے ہیں کہ جہاز سے اور مصنوعی سیارے سے جائزہ لینے پر معلوم ہو جاتا ہے کہ زمین کے نیچے کہاں لوہا ہے، کہاں سونا یا تیل... تاہم وہ انتہائی جدید آلات نہ عام دستیاب ہیں نہ کوئی خرید سکتا ہے... عام قسم کے آلات سیکیورٹی کے مقاصد میں استعمال ہو رہے ہیں اور کہیں پوشیدہ دھات کی کسی بھی چیز کی نشان دہی کر دیتے ہیں۔

موہن لال نے جو خصوصی آلہ منگوایا تھا، وہ ٹھوس چیزوں اور زمین کی کچھ گہرائی تک کسی بھی قسم کی دھات کا سراغ لگانے میں معاون تھا۔ اس سے خارج ہونے والی شعاعیں روشنی نہیں کرتی تھیں، یعنی وہ نظر نہیں آتی تھیں۔ جیسے کہ ایکسرے... یا سیکیورٹی کیمروں کی انفرا ریڈ شعاعیں۔

وہ فرش پر گھٹنے کے بل جھک کر اس آلے کو آہستہ آہستہ آگے بڑھاتا گیا۔ آلے کا ٹارچ جیسا حصہ سیمنٹ کے فرش سے ایک انچ اوپر تھا۔ اس کے چپٹے حصے میں اور ڈیڑھ انچ لمبی اور ایک انچ چوڑی اسکرین تھی جس کی تصویر کو فوکس کر کے دیکھا جا سکتا تھا... چھوٹا یا بڑا کیا جا سکتا تھا۔

کمرے میں ایک اعصاب شکن سکوت تھا۔ وہ دائیں بائیں اور اوپر نیچے سیدھے خط میں اس آلے کو فرش پر پھیرتا رہا... اگر نیچے ایک لوہے کی کیل بھی ہوتی تو آلہ بیپ دیتا... غالباً سیمنٹ کا سخت فرش اس کی شعاعوں کو پوری طرح گزرنے نہیں دے رہا تھا۔

موہن پیٹ کے بل مسہری کے نیچے گھس گیا... اور اسی وقت اچانک آلے نے پہلی بیپ دی۔ ایک ساتھ موہن اور اوما کے دل کی دھڑکن جیسے رک گئی... اوما نے اوپر سے سر جھکا کے نیچے دیکھا جہاں فرش پر اس کے شوہر کا الٹا پڑا ہوا نچلا نصف دھڑ دکھائی دے رہا تھا۔

''موہن... کچھ ہے؟'' وہ اور آگے جھک کے لٹک گئی۔

موہن نے آلے کو آگے بڑھایا۔ اس نے دوسری بیپ دی پھر تیسری... یہ مسہری کے نیچے تقریباً درمیان کا حصہ تھا۔ اوما بھی فرش پر اتر آئی۔

''اوما... مبارک ہو۔'' موہن چلایا۔

''کیا؟... مجھے بھی دکھاؤ۔'' اوما نے بے چینی سے کہا اور شوہر کے ساتھ نیچے رینگ گئی۔

موہن نے عکس کو فوکس کیا۔ ''سب کچھ ہے اوما... سارا زیور ہے... اسی حالت میں...''

اوما نے اس کی طرف جھک کے دیکھا۔ مکمل اندھیرے میں ایک چھوٹی سی تصویر روشن نظر آ رہی تھی۔ ''کیا ہے... کتنا ہے؟''

موہن نے عکس اس کے سامنے کیا۔ ''یہ دیکھو... دیکھتی جاؤ۔''

سونے کے گلوبند... کڑے... پازیب... جھمکے اور بالیاں... ہر چیز صاف نظر آ رہی تھی۔ اتنی صاف کہ ان کے ڈیزائن بھی دیکھے جا سکتے تھے۔ خوشی سے اوما کا دل سینے میں قلابازیاں کھانے لگا۔

''ہم دولت مند ہو گئے اوما۔'' اس نے فرطِ جذبات میں اوما کو لپٹا لیا۔

اوما ہنس رہی تھی اور رو رہی تھی۔ ''یہ کتنی مالیت کا ہو گا؟''

''ہم نے حساب لگایا تھا... چوبیس قیراط کا ہوا تو سمجھو ایک کروڑ... کم سے کم بھی اسی لاکھ۔''

اوما مدفون خزانے کی تصویر کو دیکھتی رہی۔ ''یہ کتنی گہرائی پر ہوگا... کیسے نکالیں گے ہم اسے؟''

''نکال لیں گے... جب یہاں تک آ گئے ہیں... تم فکر مت کرو... میرا پلان کامیاب ہو گیا ہے۔'' موہن خوشی سے پاگل ہو رہا تھا۔

''ہم لے کر کیسے جائیں گے؟''

''سب ہو جائے گا... تم دیکھتی جاؤ۔''

صبح تک وہ ساتھ ساتھ لیٹے ایک کروڑ کے بارے میں سوچتے رہے۔ انہوں نے کئی پلان بنائے... سب قابلِ عمل نہیں تھے... وہ پلان بدلتے گئے... اب وقت آ گیا تھا اپنے سارے خوابوں کو تعبیر دینے کا... خیال کو حقیقت میں بدلنے کا... تدبیر سے تقدیر بنانے کا...

''تھینک یو دادا جی... یو آر گریٹ!''

☆☆☆

موہن نے غلام علی کو چھت پر پتنگ اڑاتے دیکھا... اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ماہر پتنگ باز تھا... اس کی تین تاوے کی ست رنگی پتنگ بڑی بلندی پر تھی... شام کے سورج کی دھوپ میں اس کے رنگ نکھر آئے تھے... اس کا جوڑ مخالف سمت سے اڑائی جانے والی پتنگ سے پڑ گیا تھا جس کا رنگ گہرا سرخ تھا اور جس کے کناروں پر چاندی جیسی چمکیلی جھالر تھی... یوں لگتا تھا جیسے کسی نے دلہن کے سر سے اوڑھنی لے کر ہوا میں اڑا دی ہو۔

موہن اوپر دیکھنے لگا۔ ''تم تو کمال کے گڈی باز ہو۔''
غلام علی مسکرایا۔ ''ابھی دیکھنا اس لال چڑیا کو کیسے کاٹتا ہوں۔''

موہن نے محسوس کیا کہ غلام علی کی نظر آسمان سے زمین کی طرف ایک ہی سمت میں جا کے ٹھہر رہی ہے... پتنگ بازی کے کھیل کی سنسنی خیزی آنکھوں کے میل کے بغیر مکمل نہیں ہوتی... ہر جگہ یہی ہوتا ہے... اوپر پیچ لڑتے ہیں، نیچے نظریں لڑتی ہیں... موہن نے دس کوٹھے چھوڑ کے ایک جگہ چھت پر زرد دوپٹے کو دائرے میں لہراتا دیکھا۔

''مان گئے استاد... تمہاری نظر کو...''
غلام علی چونکا۔ ''کس کی بات کر رہے ہو؟''
''میں پتنگ کی بات نہیں کر رہا ہوں۔'' موہن لال ہنسا۔

''بوکاٹا...'' غلام علی نے نعرہ مارا اور پھر منہ میں انگلی ڈال کے سیٹیاں بجانے لگا۔ موہن نے لال چڑیا کو ہوا میں ڈولتا دیکھا۔ وہ آہستہ آہستہ بلندی سے گرنے لگی تھی۔ دس کوٹھے دور زرد دوپٹا ہی نہیں، وہ بھی گھوم رہی تھی جس کا دوپٹا تھا... موہن کو یاد آیا کہ چند روز میں بسنت ہوگی۔
''آپ کو بھی کچھ شوق ہے جی؟'' غلام علی چرخی پر ڈور لپیٹنے لگا۔
''کیوں یار... ہم کیا بوڑھے ہو گئے ہیں یا ہمارا دل نہیں ہے؟ گڈی اڑانے کا تو بس بہانہ ہوتا ہے... کوٹھے پر آنے اور بلانے کا۔'' وہ منڈیر پر بیٹھ گیا۔
غلام علی اس کے ساتھ پاؤں لٹکا کے بیٹھ گیا۔ ''شادی ایسے ہی کی تھی؟''
مون لال نے زرد دوپٹے والی کی طرف دیکھا۔
''چھوڑ دیار! آدمی جس سے پتنگ لڑائے... آنکھیں لڑائے یا عشق لڑائے، اس سے شادی بھی کرے... میں آیا تھا تم سے کچھ اور بات کرنے...''
''بولو جناب... ایسی کیا بات ہے؟''

''بہت خاص بات ہے... ہر ایک سے نہیں کی جا سکتی... کل سے میں نے بہت سوچا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ ایک تم ہی اس قابل ہو جس پر بھروسا کیا جائے۔''

غلام علی چوکنا ہو گیا۔ ''آپ کا بھروسا غلط نہیں ہوگا... انشاءاللہ۔''

موہن لال کچھ سوچتا رہا۔ یہ ظاہر کرتا رہا جیسے وہ تذبذب کا شکار ہے۔ ''تمہیں کچھ اندازہ ہے... کل ہم ادھر کیوں گئے تھے جہاں پرانی حویلی کا باغ تھا؟''

''بُرا مت ماننا... مجھے تو یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ ساٹھ سال بعد ایک تمہارے دل میں پرانی حویلی کی محبت کیسے جاگ اٹھی... پہلے تو کبھی کوئی نہیں آیا... آبائی گھر... کیا کہتے ہو تم اسے؟ جنم بھومی تو یہ سب کی تھی۔''

موہن اسے دیکھتا رہا۔ ''تمہاری جگہ میں ہوتا تو مجھے بھی شک ہوتا... کیا کسی اور نے بھی کچھ کہا؟''

''نہیں... نہیں، میرا دماغ خراب ہے سمجھ لو۔''

''خراب نہیں... بالکل ٹھیک ہے... میرے یہاں آنے کا مقصد کچھ اور ہے۔ ڈرتا ہوں کہ اور کسی کو یہ بات معلوم ہو گئی تو میری ساری محنت اکارت جائے گی... اگر تم میرا ساتھ دو... تو...''

غلام علی نے بے چینی سے پوچھا۔ ''تو کیا ہوگا؟''

''تم چاہتے ہو نا کہ تمہاری تقدیر بدل جائے؟ میں بھی چاہتا ہوں... بالکل تمہاری طرح سوچتا ہوں... اور ایسا ہو سکتا ہے، اگر تم میرا ساتھ دو تو۔''

غلام علی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''پہلے بتاؤ کہ کرنا کیا ہے؟''

''دیکھو... یہ راز فاش ہو گیا نا تو بڑی خرابی ہوگی... میرا کیا ہے... واپس چلا جاؤں گا... صبر کر لوں گا کہ جو میری تقدیر میں نہیں تھا، وہ مجھے نہیں مل سکتا تھا لیکن تم یقیناً ایک موقع گنوا دو گے۔''

''کیسا موقع؟''

''اپنی تقدیر سنوارنے کا... اپنے خوابوں کو تعبیر دینے کا۔''

''دیکھو... کھل کے بات کرو۔''

موہن نے ایک گہری سانس لی۔ ''او کے... فرض کرو میرے پاس کسی مدفون خزانے کا نقشہ ہے... وہ میں کھود کے نہیں نکال سکتا... مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے... خزانہ نکالنے کے بعد یہ ہو سکتا ہے کہ تمہارے دل میں بے ایمانی آ جائے... تم مجھے نکال باہر کرو... یہ تمہارے لیے کوئی مشکل نہیں ہوگا... لیکن اس صورت میں جھگڑا ضرور ہوگا اور جو راز میرے تمہارے درمیان ہے... راز نہیں رہے گا... میں تو بیچ میں سے نکل جاؤں گا لیکن اور درجنوں لوگ آ جائیں گے... معاملہ پھر تمہارے ہاتھ سے نکل کے تمہارے بڑوں کے ہاتھ میں چلا جائے گا... جونیئر اور سینئر نانا... ان کی اولادیں... بہوئیں... پوتے، نواسے... میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ پہلے وہ کیا تھے... ان چار بھائیوں نے کیسے رائے بہادر چمن لال کی حویلی پر قبضہ کیا تھا... آج وہ میرے سامنے کہتے ہیں کہ ہم نے حویلی خریدی تھی... کہنے دو... مجھے کیا فرق پڑتا ہے... آج ان کے بال چٹے ہو گئے ہیں اسی لیے شاید دولت کو سب میں انصاف اور ایمان داری سے تقسیم کر دیں... لیکن مائی ڈیئر غلام علی... اگر ایسا ہوا... تو تمہیں کیا ملے گا؟ تمہارا حصہ کیا ہو گا؟''

غلام علی اسے خاموشی سے تکتا رہا اور اپنے ہونٹ کاٹتا رہا۔

موہن لال نے بات آگے بڑھائی۔ ''میرے ساتھ تمہارا حصہ آدھا ہوگا اور یہ آدھا میرے اندازے کے مطابق پچاس سے چالیس لاکھ کے درمیان ہوگا۔''

غلام علی کا منہ کھل گیا۔ ''چالیس... لاکھ؟''

''ہاں... یہ کم سے کم ہے... لیکن یہی رقم چالیس دعوے داروں میں بانٹ دی جائے تو تمہیں ملیں گے صرف دو لاکھ... مجھے محض مایوسی اور ذلت۔''

خاموشی کا ایک مختصر وقفہ آیا... پھر غلام علی نے کہا۔ ''کیا گارنٹی ہے تمہارے پاس؟''

''گارنٹی ہے... کہ... میں پاگل نہیں ہوں کہ اتنا بڑا خطرہ مول لے کر دشمن ملک میں آیا ہوں... ایسے خطرناک حالات میں... کوئی بھی مجھے شہید کر سکتا ہے۔ میں غلط کہہ گیا... شہید ہوتے ہیں مسلمان... کافر جہنم رسید ہوتے ہیں۔''

''میں تمہارا ساتھ دوں گا... نقشہ کہاں ہے؟''

''نقشہ میرے پاس محفوظ ہے... لیکن میرا خیال ہے کہ اب ہمیں نیچے چلنا چاہیے ورنہ خوامخواہ کسی کو شک ہوگا... گھر میں ہم بات بھی نہیں کریں گے۔''

''ٹھیک ہے... ہم باہر چلتے ہیں... چار پانچ میل دور دریا ہے... وہاں تازہ مچھلی ملتی ہے... تم کھاتے ہو نا؟''

''میں سب کھاتا ہوں۔'' موہن لال نے کہا۔

دریا تک وہ موٹر سائیکل پر گئے۔ وہاں ایک کچی دیواروں اور ٹین کی چھت والی دکان میں ایک بوڑھا تازہ مچھلی تل رہا تھا۔ کنارے پر پلاسٹک کی میزیں کرسیاں لگی

رات کے وقت کھدائی کرو تو کسی کو پتا نہیں چلے گا... وہ جگہ سنسان پڑی ہے... نہ کوئی تمہیں دیکھے گا... نہ تمہاری آواز سنے گا۔''

''ایک بات بتاؤ... تم یہ سونا واپس بھارت کیسے لے جاؤ گے؟''

''وہ میرا کام ہے... میں نے سب سوچ لیا ہے... میں نے بڑے کشٹ اٹھائے ہیں... تمہیں تو کچھ بھی نہیں کرنا... زیادہ سے زیادہ دو راتوں کا کام ہوگا۔''

اچانک غلام علی نے ہاتھ ملایا۔ ''مجھے منظور ہے۔''

''تم یہ کام آج ہی کرو گے... میں زیادہ انتظار نہیں کر سکتا... مگر یہ مت سمجھنا کہ میرے قیام کی پوری مدت تم اس کام کو ٹال دو گے... میرا ویزا ایک مہینے کا ہے... اسے میں بڑھوا بھی سکتا ہوں... ضروری یہ بھی نہیں کہ میں یہاں رہوں... اگر مجھے شک ہوا کہ تم مجھے ٹالنا چاہتے ہو۔''

''تمہیں ٹالنے سے مجھے کیا ملے گا؟''

''پورا حصہ... لیکن ایسا نہیں ہوگا... مجھے واپس جانا پڑا تو میں یہاں کسی وکیل کے ذریعے کورٹ میں اپنا کلیم داخل کر جاؤں گا... میں جانتا ہوں کہ مجھے کچھ بھی نہیں ملے گا... لیکن تمہیں بھی کچھ نہیں ملے گا... سب حرام خور حکام ہضم کر جائیں گے یا سرکار کی تحویل میں چلا جائے گا۔''

''میں صرف تین دن میں مال برآمد کرلوں گا... تم کہو تو میں قرآن پر ہاتھ رکھ کر حلف بھی اٹھا سکتا ہوں کہ میرے دل میں کوئی بے ایمانی نہیں۔''

''حلف اٹھانے کی ضرورت نہیں... بے ایمانی کرو گے تو خود اپنے پیروں پر کلہاڑی مارو گے۔''

موہن لال نے ایسی ہی ایک کہانی عبدالرشید کو بھی سنائی لیکن اسے ایک عمل کے چکر میں ڈال دیا جو اسے تین راتوں تک چاند نکلنے کے بعد اکیلے میں چھت پر پڑھنا تھا۔ یہ دبے ہوئے خزانے کا سراغ لگانے کا عمل تھا... جانے سے پہلے مالکوں نے کہیں دولت چھپائی ہوگی تو اسے یوں نظر آنے لگے گی جیسے کسی ڈاکٹر کو ایکسرے سے ٹی بی کی بیماری نظر آتی ہے۔

''تم سمجھتے ہو، حویلی میں کہیں دولت ہوگی؟''

''ہونی تو چاہیے۔'' موہن لال نے کہا۔ ''جو ہندو سیٹھ یہاں سے بھاگے تھے، وہ اپنی دولت کہیں گاڑ گئے تھے کہ کبھی واپس آ کے نکال لیں گے... میرے باپ دادا بھی تن کے دو کپڑوں میں گئے تھے۔''

''تم اسی کے چکر میں تو نہیں ہو؟''

موہن لال ہنسا۔ ''اس کا پتا چل جائے... تب بھی وہ میرے لیے بے کار ہے... میں اسے بھارت تو نہیں لے جا سکتا۔''

''ٹھیک ہے... میں آج ہی رات عمل شروع کر دوں گا... ایک ہفتے بعد تو چاند کی آخری تاریخیں شروع ہو جائیں گی۔''

دراصل یہی دونو جوان تھے جن کے کمرے آگے پیچھے تھے... ایک طرف وہ سوتے تھے... دوسری طرف چار چھ بچے... خطرہ انہی سے تھا۔

ابھی سردیاں ختم نہیں ہوئی تھیں۔ رات کو سب اپنے کمروں کے دروازے بند کر کے اور لحاف اوڑھ کے سوتے تھے۔ عورتوں، بچوں کی نیند سے موہن لال کو خطرہ نہیں تھا۔ معمولی شور سے ان کے جاگنے کا احتمال نہیں تھا۔ عورتیں دن بھر کے کام کاج کے بعد تھکن سے بے حال ہوتی تھیں۔ مرد بھی صبح کے گئے رات کو لوٹتے تھے۔ اصل فکرمندی زیادہ عمر کے لوگوں کی طرف سے تھی جو دن بھر کچھ نہیں کرتے تھے، چنانچہ رات بھر کروٹیں بدلتے تھے۔ اس عمر میں ان کی نیند کم ہو گئی تھی اور وہ نیند ایک آرزو ہو گئی تھی جسے جوانی کی نیند کہا جاتا ہے۔

موہن لال نے کچھ بزرگوں کا انتخاب کیا۔ قسمت یقیناً اس کی مدد کر رہی تھی ورنہ وہ اتنے مرحلے بھی طے نہ کر پاتا... ابھی تک اس کا پلان کامیاب جا رہا تھا۔ چوتھے دن شام کے وقت وہ صحن میں بڑے چھوٹے نانا کی بکواس بڑی سعادت مندی سے سن رہا تھا اور دونوں بوڑھے خوش تھے کیونکہ ان کی اپنی اولادیں ان سے بھاگتی تھیں... سب مصروف تھے اور ان کے پاس بیٹھنے کے لیے کسی کے پاس وقت نہ تھا... وہ اس کو پرانے واقعات سنا رہے تھے... یہ سمجھتے ہوئے کہ اسے اپنے ماضی سے بڑی عقیدت ہے۔

اچانک اشرف علی نے کہا۔ ''پتر موہن... ہم نے کئی بار تیرے دادا سے حویلی خریدنے کا ذکر کیا... تو نے ایک بار بھی اعتراض نہیں کیا؟''

''اعتراض کیسا نانا جی! خریدی ہوگی آپ نے۔''

''یہاں لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے قبضہ کیا تھا۔'' اشرف علی بولا۔

''مجھے ایسا کوئی شخص نہیں ملا۔''

''کیونکہ تو لوگوں سے نہیں ملا... اب وہ زمانہ نہیں رہا

جب ہمارا سارے علاقے پر زور چلتا تھا... ہم چار بھائی بڑے طاقتور تھے... ہمارے مقابلے پر آنے کی ہمت کسی میں نہ تھی... چھوٹے موٹے جھگڑے نمٹانے کے لیے لوگ بھی آتے تھے اور خود پولیس ہم سے کہتی تھی... لین دین کے جھگڑے ہم مکا دیتے تھے۔''

بشیر علی نے وضاحت کی۔ ''ایک بار مولوی صاحب روتے ہوئے آئے کہ بندہ شراب پی کے میری بیٹی سے کہتا ہے تو بھی پی... وہ نمازی پرہیزگار... اسے مارتا ہے... کئی بار گھر سے نکالا... اب طلاق کی دھمکی دے رہا ہے... اصل بات یہ تھی کہ وہ ناجائز کام پر راضی نہیں ہوتی تھی... ہم نے سب ٹھیک کر دیا۔

''کہنے کا مطلب یہ ہے پتر... طاقت کا بھی ناجائز استعمال ہم نے کبھی نہیں کیا تھا... بدمعاشی کے بھی اصول ہوتے تھے پہلے... رائے بہادر چمن لال بھی ضرورت پڑنے پر ہمیں بلاتا تھا... اس کے دشمن بہت تھے... جب یہ خون خرابا شروع ہوا تو وہ بہت پریشان تھا... ہم نے بڑی تسلی دی کہ ہمارے ہوتے کس کی مجال ہے کہ حویلی میں گھسے... لیکن وہ ڈرا ہوا تھا... آخر میں اس نے کہا کہ اشرف علی... مجھے لگتا ہے کہ ادھر اپنا گزارہ نہیں ہوگا... مجھے جانا ہی پڑے گا... تم میری زمین کا سودا کرا دو... یہ بہت مشکل کام تھا... خریدار کوئی نہیں ملتا تھا... سب ایسے ہی قبضے کرنے کو تیار بیٹھے تھے... پھر بھی ہم نے کوشش کی... کوڑیوں کے مول گئی زمین... بڑی اچھی نہری زمین تھی اور بہت زرخیز... دس ہزار ایکڑ کے ہزار دینے والے بھی کہتے تھے کہ چمن لال چلا گیا تو کیا ہوگا... انتقالِ اراضی کا سارا کام بند تھا... ہم نے پکی رسید لکھوا کے دی اور خود گواہ بنے... باغ پر ڈپٹی کمشنر نے بعد میں قبضہ کیا... اس سے کون قیمت مانگتا؟ لیکن چمن لال انگریز کمشنر کے پاس گیا... پھر گورنر کے پاس... اس کی رائے بہادری کی سند کام آئی اور سنا ہے گورنر نے سودا کرا دیا تھا... کتنی رقم ملی تھی... یہ مجھے نہیں معلوم۔''

بشیر علی کی بات پھر اشرف علی نے اچک لی۔ ''آخر میں رہ گئی تھی حویلی... وہ ہم نے خریدی... بے شک سودا غیر قانونی تھا اور چمن لال نے مجبوری میں کیا... اسے قیمت بھی بہت کم ملی... لیکن ہماری کوشش سے اس کو جتنی رقم ملی... اس کا چمن لال نے سونا خرید لیا... ہمارے مشورے سے۔''

موہن لال کے دل نے سینے میں ایک قلابازی کھائی۔

''کیا سونا خریدا؟''

''ہاں پتر! ہم نے کہا کہ نوٹ تو کاغذ ہوتے ہیں... کیا پتا ادھر چلیں نہ چلیں... جو ادھر سے جا رہے تھے سب سونا ہی لے جاتے تھے۔''

موہن نے پوچھا۔ ''انہیں راستے میں لٹ جانے کا ڈر نہیں ہوتا تھا؟''

''سونا کیا... راستے میں جان چلی جاتی تھی... گھر کی عورتیں اٹھالی جاتی تھیں... پھر بھی لوگ گئے... سونا ملتا نہیں تھا... یا سنار مہنگا دیتے تھے... ہم نے یہ کیا کہ سونا خود خریدا... ایک تو سنار ہمیں جانتا تھا پھر ہم نے کہا کہ سونا بیٹی کی شادی کے لیے چاہیے... چمن لال کو تقریباً سو تولے سونا زیادہ مل گیا۔''

موہن لال نے محتاط لہجے میں سوال کیا۔ ''اپنے ساتھ دادا جی کتنا سونا لے گئے تھے؟''

بڑے بھائی نے چھوٹے کی طرف دیکھا۔ ''کچھ پتا نہیں... گھر کی عورتوں کا بھی کافی زیور تھا... میرا خیال ہے سیروں سونا ہوگا۔''

موہن نے حیرت سے سن رہ جانے کی اداکاری کی۔

''سیروں؟''

''ہاں... یہ سب اس لیے بتا رہے ہیں پتر موہن لال... کہ تیرے دل میں کوئی شک نہ رہے... ہم نے واقعی یہ حویلی خریدی تھی... بے شک سستی لی لیکن مفت نہیں لی تھی... قبضہ نہیں کیا تھا اس پر حالانکہ کر سکتے تھے۔''

موہن لال بولا۔ ''پھر وہ سونا کہاں گیا؟''

بے خبر

ایک اجاڑ اور ٹوٹی پھوٹی عمارت کے پاس سے گزرتے ہوئے ایک صاحب نے ایک زرد رو راہ گیر سے پوچھا۔ ''سنا ہے اس کھنڈر نما عمارت میں مدتوں سے بدروحیں رہتی ہیں۔''

زرد رو شخص بے زاری سے بولا۔ ''پتا نہیں، آپ کسی اور سے پوچھ لیں۔ مجھے تو مرے ہوئے صرف تین سال ہوئے ہیں۔''

گواہی

''جو الفاظ مدعا علیہ نے کہے تھے، ذرا وہ تو دہراؤ!'' وکیل نے گواہ سے کہا۔

''جناب! وہ الفاظ ایسے نہیں ہیں جو کسی شریف آدمی کے سامنے دہرائے جا سکیں۔'' گواہ نے سر جھکا کر جواب دیا۔

''اچھا، یہ بات ہے تو پھر وہ الفاظ جج صاحب کے کان میں کہہ دو۔'' وکیل نے بلاتوقف اسے ہدایت کی۔

''کہاں گیا؟ چمن لال ساتھ لے گیا ہوگا... اسی لیے خریدا تھا۔''

''ان کو اچانک بھاگنا پڑا تھا؟''

''اتنا اچانک بھی نہیں... وہ دن میں چلا گیا تھا... کچھ لوگوں نے رات کو حملہ کر کے حویلی لوٹنے کی اور اسے قتل کرنے کی کوشش کی تھی... لیکن ہم نے سب کو بھگا دیا... تیرے دادا کی ایک شکاری بندوق تھی... وہ خود شکار نہیں کرتا تھا... شکار کھیلنے اس کے پاس بڑے لوگ آتے تھے... ہم نے اسی بندوق سے دو فائر کیے... وہ ڈبل بیرل یا تیس بور کی ولایتی رائفل تھی... اس کی آواز کسی بم کے دھماکے جیسی ہوتی تھی... سارے حملہ آور ایسے بھاگے...''

''لیکن نانا جی! ان کے پاس کچھ نہیں تھا... جب وہ دہلی پہنچے۔''

اشرف علی نے کہا۔ ''کسی نے چھین لیا ہوگا راستے میں۔''

''ایسا ہوتا تو پتا جی بتاتے... دادی نے بھی نہیں بتایا۔''

''پھر ہم کیا بتائیں پتر! اس نے بیچ دیا ہوگا وہ بھی۔''

موہن لال نے مزید بحث نہیں کی۔ یہ تو اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا کہ سارا سونا کہاں محفوظ پڑا ہے۔ بس اس معاملے میں چمن لال نے اپنے محافظوں پر اعتبار کیا تھا اور نہ اپنی بیوی پر... خوابوں کے سچ ہونے پر اس کا کبھی اعتبار نہ تھا... پھر وہ خواب میں ایک ایسے شخص کی بات مان کے کیوں اس موت کے سفر پر نکل کھڑا ہوا جو مرتے وقت پاگل ہو چکا تھا... کیا خود اس نے پاگل ہونے کا ثبوت نہیں دیا تھا؟

دراصل بات صرف خواب پر یقین کرنے کی نہیں تھی... موہن لال کی دادی بھی جب مرنے کے قریب تھی تو ایک بار اس نے موہن کی ماں سے اکیلے میں کہا تھا کہ بہو! تجھے ایک راز کی بات بتا رہی ہوں... حویلی کی بنیاد میں سارا خزانہ گڑا ہوا ہے... میرے سوا یہ راز کسی کو معلوم نہیں... چند دن بعد وہ مرگئی۔ بعد میں بہو نے اس بات کا ذکر اپنے شوہر روشن لال سے کیا تو اس نے اہمیت نہیں دی۔ آخری وقت میں حواس جواب دے جاتے ہیں اور آدمی ایسی ہی الٹی سیدھی باتیں کرتا ہے... مزید یہ کہ تصدیق یا تردید صرف چمن لال کر سکتا تھا جو بالکل ہی پاگل ہو چکا تھا اور پاگل خانے میں تھا۔

ساس بہو میں بنی کبھی نہ تھی... ایک کہتی دن ہے تو دوسری رات سمجھتی لیکن نہ جانے کیوں موہن کی ماں کے دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی کہ بڑھیا نے مرتے وقت ڈراما نہیں کیا تھا۔ اس نے کمرے سے سب کو نکال کے بہو کو راز کی بات بتائی تھی تو اس کے دماغ میں کچھ تھا۔ اس نے شوہر سے کہا بھی کہ آخر تمہارا باپ خالی ہاتھ کیوں آیا؟ اتنا زیور تھا تمہاری ماں کا وہ کدھر گیا... کیا پتا اس نے کہیں گاڑ دیا ہو... روشن لال نے اسے ہمیشہ جھڑک دیا کہ کیا تمہیں معلوم نہیں ہم کس حال میں جان بچا کے نکلے تھے؟ ایک بار موہن نے ان کی باتیں سنی تھیں... اس وقت وہ بہت چھوٹا تھا... ماں پتا نہیں کس کا حوالہ دے رہی تھی کہ وہ ساری دولت آنگن میں گاڑ آئے تھے... چمن لال نے بھی ایسا نہ کیا ہو؟ اس پر شوہر نے بیوی کے ایک جھانپڑ رسید کیا تھا اور کہا تھا کہ تو جا کے نکال لے... میرا دماغ خراب مت کر... وہ اس وقت بھی کھاتے کھول کے بیٹھا ہوا تھا اور دکان کا حساب کر رہا تھا۔

موہن نے سب سنا تھا اور پھر باپ کے غصے کے ڈر سے رضائی میں منہ چھپا لیا تھا۔ خواب میں دادا نے گڑے ہوئے سونے کی بات کی تو اسے تمام پرانی باتیں یاد آ گئیں۔ وہ سوچتا رہا اور اس کی چھٹی حس نے کہا یا لاشعور میں دبی ہوئی خواہش نے کہ دنیا میں ناممکن کچھ بھی نہیں ہوتا... یہ ہوا میں چلایا ہوا تیر تھا جو نشانے پر جا بیٹھا تھا۔

اس رات عبدالرشید نے موہن کو اکیلے میں روک لیا۔

''بھائی جی! آپ نے سونا بنانے کے فارمولے کی بات کی تھی۔''

موہن لال نے سوچ کے کہا۔ ''وہ تمہارے بس کی بات نہیں۔''

''میں سب کر سکتا ہوں۔''

''کچھ چیزیں ہر جگہ نہیں ہوتیں... میں تمہیں لکھ دوں گا... کیا یہاں کوئی پرانا قبرستان ہے... کوئی سو دو سو سال پرانا؟''

موہن کو معلوم تھا کہ پرانی دھنسی ہوئی قبروں میں رات کے وقت روشنی سی نظر آتی ہے۔ یہ ہڈیوں کا فاسفورس ہوتا ہے جو اندھیرے میں چمکتا ہے لیکن یہ بات عبدالرشید نہیں جانتا تھا... وہ سوچ میں پڑ گیا۔ ''یہاں تو نہیں مگر کچھ فاصلے پر ہے۔''

''کیا تم نے کبھی کسی پرانی قبر میں جھانکا ہے... رات کے وقت؟''

وہ کانوں کو ہاتھ لگانے لگا۔ ''میں دن میں ادھر سے نہیں گزرتا۔''

''پھر تم یہ کام کیسے کرو گے... تمہیں کسی قبر کی مٹی لانی ہے جو سو سال یا اس سے بھی زیادہ پرانی ہو... اگر تم اندھیری

رات میں دیکھو تو اس کے اندر ایک چمک دکھائی دے گی... یہ سونا ہوتا ہے۔''
''مٹی میں سونا؟'' رشید دم بہ خود رہ گیا۔
''ہاں... یہ محاورہ ایسے ہی نہیں بنا... سو سال بعد قبر کی مٹی میں ایسے کیمیائی اجزا بننے لگتے ہیں... جن کی مدد سے سونا بنایا جا سکتا ہے... جس مٹی میں زیادہ چمک ہوگی، اس میں یہ اجزا بھی زیادہ ہوں گے اور اس سے سونا بنانے کے عمل میں کامیابی کا تناسب بڑھ جائے گا... کسی بھی دھات سے۔''
''آپ فکر مت کرو... میں مٹی لاؤں گا۔''
''کیسے لاؤ گے... تم تو ڈرتے ہو قبرستان جاتے ہوئے... حالانکہ ڈرنے کی کیا بات ہے؟''
''اگر... میں اپنے ساتھ کسی کو لے جاؤں... اپنے کزن کو...؟''
''لے جاؤ... ایک چھوڑ دو کو لے جاؤ... مگر انہیں بتاؤ گے کیا؟''
''ان کو پتا ہے کہ میں سونا بنانا چاہتا ہوں... لالچ ان کو بھی ہے... اسی لیے وہ سٹہ کھیلتے ہیں مگر ہار جاتے ہیں۔''
اپنی طرف سے موہن لال ہر قدم سوچ سمجھ کے اٹھا رہا تھا اور پکا کام کر رہا تھا۔ اس کے باوجود اس کو اطمینان نہیں تھا... خوف کی ایک لہر سی تھی جو اسے بے چین رکھتی تھی کہ کہیں عین وقت پر کوئی آ نہ جائے... پھر اوما نے اسے ایک ایسی خبر سنائی کہ اس نے عملاً اوما کا منہ چوم لیا... بار بار...
اس نے موہن کو مطلع کیا۔ ''کل رات یہاں قوالی ہے۔''
''وہ کس خوشی میں؟''
''ہر مہینے کی پہلی جمعرات کو ہوتی ہے... رات بھر چلتی ہے۔''
شام کو اس نے اشرف علی سے پوچھا۔ اس نے اپنے پیر صاحب کا نام لیا کہ یہ ان کا حکم تھا... قوال شہر سے آتے ہیں... ایک رات کا نذرانہ پانچ ہزار لیتے ہیں... رات کے کھانے کے بعد قوالی شروع ہوتی ہے... دس گیارہ بجے کے بعد... اور صبح فجر کی اذان پر ختم ہوتی ہے۔
''پھر تو بڑا مزہ آتا ہوگا... لوگ بھی آتے ہوں گے؟''
''ہاں... صحن بھر جاتا ہے... ایک طرف مرد بیٹھتے ہیں... دوسری طرف قنات کے پیچھے عورتیں... میٹھے چاولوں کی دیگیں بنتی ہیں۔ صبح تقسیم ہوتا ہے یہ تبرک۔''
ایک دم موہن لال کو یوں لگا جیسے اس کے سارے مسئلے جن کے لیے وہ اب تک پریشان تھا اور سوچ کر چلا رہا تھا... خود بہ خود حل ہو گئے ہیں۔
قوالی کے لیے تیاریاں دوپہر کے بعد ہی شروع ہو گئی تھیں۔ تخت جوڑ کے قوالوں کے لیے اسٹیج گیٹ کی سیدھ میں بنایا گیا تھا۔ اس طرح کہ سامعین سامنے رہیں... تھوڑی تھوڑی کر کے موہن اور اس کی بیوی نے بہت سی کارآمد معلومات اکٹھی کر لیں، مثلاً یہ کہ رات کو قوالوں... کچھ معزز مہمانوں اور گھر والوں کے لیے چائے کے تین دور چلتے ہیں۔ ایک قوالی شروع ہونے سے پہلے... دوسرا درمیانی وقفے میں اور تیسرا قوالی ختم ہونے کے بعد... چائے گھر میں ہی بنائی جاتی ہے۔ بہوئیں چائے تیار کرتی ہیں اور نوجوانوں کے ساتھ بچے سروس کرتے ہیں... گھر کی عورتوں کے علاوہ قوالی سننے کے لیے آنے والی خواتین بہت کم ہوتی ہیں۔
موہن لال کو علم تھا کہ قوالیوں میں کتنا شور شرابا ہوتا ہے... اس کی تو عین خواہش تھی کہ باہر قوال خواب گلا پھاڑیں... طبلے پھاڑیں اور کانوں کے پردے پھاڑیں... اس سے بھی زیادہ خوشی کی بات یہ ہوگی کہ گھر کے سارے چھوٹے بڑے اپنے کمروں میں نہیں ہوں گے اور وہ سب موہن لال کے کمرے سے اتنی دور ہوں گے کہ اندر وہ فرش کو ہتھوڑے سے بھی توڑے تو کسی کو بھی پتا نہیں چلے گا۔
اور ایسا ہی ہوا... طے شدہ پروگرام کے مطابق موہن نے بخار اور سر درد کا بہانہ کیا... گھنٹا بھر قوالی سننے کے بعد وہ کچھ دیر کے لیے آرام کرنے کا بہانہ کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے اس نے سوٹ کیس میں سے چھوٹی سی مگر بہت تیز ماربل ٹائل کاٹنے والی مشین نکالی اور اسے پلگ میں لگا کے مسہری کے نیچے گھس گیا۔ اسے بالکل صحیح اندازہ تھا کہ اسے کہاں سے اور کتنی جگہ کو کاٹنا ہوگا... اس کے پاس بلا مداخلت کام کرنے کے لیے کم سے کم آدھا گھنٹا ضرور تھا... اس کے بعد اوما ہی سب سے پہلے اس کی خبر گیری کے لیے آئے گی اور واپس جا کے بیان دے گی کہ وہ گولی کھا کے سو رہے ہیں... ظاہر ہے قوالی سننے کے لیے اٹھنے پر کون مجبور کرے گا؟
موہن نے بڑے اطمینان سے فرش کو ایک لکیر لگا کے کاٹا... وہ ایک فٹ چوڑائی کے ٹائل کاٹ کے ترتیب سے رکھتا گیا۔ دو بار اس نے اسکینر سے چیک کیا... وہ بالکل صحیح جگہ پر فرش کھود رہا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد اس نے دروازے پر دستک سنی جس میں چوڑیوں کی جھنکار بھی شامل تھی لیکن اس نے اندر سے پوچھ کے تصدیق کی کہ وہ اوما ہی ہے۔
اوما نے اپنے پیچھے دروازہ فوراً بند کر دیا۔ ''سب ٹھیک ہے؟''

”اے ون... وہاں کسی نے مجھے پوچھا؟“

”پوچھا تھا... میں نے کہا کہ دیکھ کر آتی ہوں... چائے کا پہلا راؤنڈ چل رہا ہے... دوسرا شاید ایک ڈیڑھ بجے ہوگا۔“

”اپنا کام ہوشیاری سے کرنا۔“

”فکر مت کرو... میں نے چھوٹی بھابی کو ساتھ ملا لیا ہے... ہم دونوں مل کے چائے تیار کریں گے... کسی بڑھیا نے اعتراض کیا تو میں کہہ دوں گی کہ میں صرف چھوٹی بھابی کا ساتھ دے رہی ہوں... برتنوں کو ہاتھ نہیں لگاؤں گی... چھوٹی بھابی اس ڈھکوسلے کی قائل نہیں... اچھا، اب میں جاتی ہوں۔“

موہن لال نے اوپر والا فرش کاٹنے کے بعد نیچے کے پتھر نکالنے شروع کیے... اس کے لیے ایک فٹ قطر کا گڑھا کافی تھا۔ اس کے اندازے کے مطابق زیورات زیادہ گہرائی میں دفن نہیں ہو سکتے تھے... چمن لال اور اس کی بیوی ایک رات میں کتنا فرش توڑ کے کتنی کھدائی کر سکتے تھے... پھر انہیں فرش بنانا بھی تھا اور وہ کوئی پیشہ ور مزدور نہیں، خاندانی رئیس تھے۔ نہ ان کے جسم مشقت برداشت کر سکتے تھے اور نہ ہاتھ سخت کام کے عادی تھے۔

موہن کا یہ اندازہ بھی درست نکلا... زیورات کی پوٹلی صرف ایک فٹ کی گہرائی پر نمودار ہوگئی۔ دھڑکتے دل اور کانپتے ہاتھوں کے ساتھ موہن لال نے اسے باہر کھینچنا چاہا مگر وہ سیمنٹ میں پھنسی ہوئی تھی... اس نے ایک ایک کر کے زیورات کو باہر نکالا۔

یہ بڑا خطرناک وقت تھا۔ اس وقت کوئی آ جاتا تو ایک نظر میں موہن لال کے عزم سفر اور وطن کی محبت کی ساری اصلیت سامنے آ جاتی۔ ایک بار اسے خیال آیا کہ وہ کچھ دیر کے لیے کام روک دے لیکن باہر قوالی پورے عروج پر تھی... قوال چیخ رہے تھے... جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے... تو ہی تو... تو ہی تو... تو ہی تو... طبلے کی تھاپ، ڈھولک کی دھمک... تالیاں... سب کا ملا جلا شور موہن کے کانوں تک پہنچ رہا تھا۔ اس نے کام جاری رکھنے کا فیصلہ کیا... انٹرویل ہونے میں ابھی ایک گھنٹا باقی تھا۔

تھیلی سارے زیوروں سے خالی ہوگئی تو موہن نے گڑھا دوبارہ بھرا اور ایک ایک کر کے ٹائلوں کو جمانے لگا۔ سارا کام بڑی صفائی سے ہوا تھا... جب تک کوئی مسہری کے نیچے گھس کے نہ دیکھتا، اسے کٹا ہوا فرش نظر نہیں آ سکتا تھا۔ ٹائلوں کو جدا کرنے والی لکیر ایک ملی میٹر چوڑی تھی اور باہر والی لکیر بھی مسہری کے نیچے ایک فٹ اندر تھی۔

موہن نے باہر آ کے بڑی پھرتی سے کٹر مشین کو واپس

اپنے سوٹ کیس میں رکھا... پھر زیورات کو اپنے سوٹ کیس میں ڈالا... اس کے لیے کپڑوں کے نیچے ڈبل باٹم تھا لیکن باہر سے اس کا کوئی اندازہ نہ ہوتا... اچانک قوالی کا شور تھم گیا۔

موہن نے اطمینان کا سانس لیا... اس کا سارا کام توقع سے کم وقت میں اور کسی مداخلت کے بغیر ختم ہو گیا تھا... اس نے جلدی سے ہاتھ پیر صاف کیے اور دروازے کی کنڈی کھول کے بیڈ پر لیٹ گیا... یہ ہو سکتا تھا کہ اس کے خیرخواہوں میں سے کوئی اوما کے ساتھ آ جائے... دروازہ اندر سے بند ملتا تو انہیں خوامخواہ شک ہوتا۔

ابھی چند منٹ ہی گزرے تھے کہ اس نے اوما کی آواز سنی... یقیناً کوئی اس کے ساتھ آ گیا تھا... دوسرے لمحے دروازہ کھلا اور وہ اشرف علی کے ساتھ اندر آ گئی... موہن لال نے آنکھیں کھول کے دیکھا اور اٹھ بیٹھا...

''ہاں پتر موہن لال! کیسی ہے طبیعت؟'' اس نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا اور پھر کسی ماہر حکیم کی طرح نبض دیکھی۔

''ٹھیک ہے چھوٹے نانا جی... میں آنے ہی والا تھا... اتنا مزہ آ رہا تھا قوالی میں لیکن کیا کرتا... سر کے درد نے بیٹھنے نہیں دیا۔''

''اب تو بخار بھی نہیں ہے... خیر سے... مزہ تو اب آئے گا۔''

'مزہ بہت آتا اگر کام پورا نہ ہوتا'... موہن لال نے سوچا... اب کیا خاک مزہ آئے گا... صبح تک بیٹھنا پڑے گا... پھر وہ گڑ کے میٹھے چاول بھی کھانے پڑیں گے... لیکن اب موہن لال کو یہ تکلیف عین راحت محسوس ہو رہی تھی... کامیابی نے اس کے جسم میں حرارت، توانائی اور بجلی سی بھر دی تھی۔

موہن لال نے اشرف علی... کے جاتے ہی اوما کو چمٹا لیا اور چوم چوم کے بے حال کر دیا۔ ''اوما! ہمارے خواب پورے ہو گئے... ہمیں سب مل گیا جس کے لیے ہم یہاں آئے تھے... تم بلاوجہ ڈر رہی تھیں... ایک کروڑ کا سونا ساٹھ سال بعد ہمیں مل گیا اور یہاں کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی۔''

اوما نے گہری گہری سانسوں میں کہا۔ ''بس اب یہاں سے نکل چلو موہن۔''

''تم فکر مت کرو... کل ہم اس شان سے جائیں گے جس شان سے آئے تھے... لیکن آتے وقت ہم پھکو تھے... اب کروڑ پتی ہیں... تمہیں اب کچھ کرنے کی ضرورت نہیں... کام ویسے ہی ہو گیا۔''

اگر کام پورا نہ ہوتا تو اوما کچھ لوگوں کو چائے میں نیند کی دوا کے قطرے ڈال کے پلا دیتی... بچے تو پہلے ہی نیند میں لڑھک رہے تھے... بڑھیاں زبردستی جاگ رہی تھیں... ایک ایک کر کے وہ بھی نیند سے مغلوب ہو کے اٹھنے پر مجبور ہوئیں... صرف مرد صبح تک جاگے... چائے کے آخری راؤنڈ میں ان کو بھی سلا دیا جاتا لیکن اب اس کی ضرورت ہی نہیں رہی تھی۔

صبح قوالی ختم ہونے تک موہن لال موجود رہا۔ اس نے سب کے ساتھ میٹھے چاول کھائے اور چائے پی... سورج نکلنے کے بعد قوال اپنا نذرانہ اور کچھ انعام کی رقم سمیٹ کر رخصت ہوئے تو رات بھر کے جاگے ہوئے ایسے پڑ کے سوئے کہ دوپہر تک حویلی میں سناٹا رہا... صرف موہن لال اور اس کی بیوی جاگتے رہے اور اپنے خواب شمار کرتے رہے، کمرے کی چھت ان کے لیے جیسے سینما کی اسکرین بن گئی تھی جس پر وہ ایک کروڑ کے سونے سے خریدی جانے والی تمام خواہشات، خوشیاں اور امیدیں دیکھ رہے تھے۔

اب ان کے سامنے آخری مرحلہ واپس سرحد پار کرنے کا تھا... جب وہ آئے تھے تو خالی ہاتھ تھے۔ ان کے پاس کوئی قابلِ اعتراض چیز نہیں تھی... اب پانچ سیر سونے کے ساتھ دوبارہ سرحد پار کرنا آسان نہ تھا۔ دشمن ملک کے سفر میں وہ محفوظ اور کامیاب رہے تھے... لوٹ کر اپنے گھر جانے کا مرحلہ زیادہ پُرخطر ہو گیا تھا۔

لیکن موہن لال کو اس کا علم تھا... جب اس نے منصوبہ بندی کی تھی تو دونوں طرف کے سفر کی مشکلات کو سامنے رکھا تھا۔ اب تو اوما کو بھی اپنے شوہر کی ہمت، ذہانت... دوراندیشی اور منصوبہ سازی کی صلاحیت پر پورا اعتبار ہو چکا تھا... وہ جو کہتا تھا، کر دکھاتا تھا... اس کا ثبوت سب سے پہلے موہن لال نے اوما سے شادی کر کے دیا تھا۔

اگلے دن شام کے وقت موہن لال نے رونی شکل بنا کے اعلان کیا کہ انہیں واپس جانا ہے۔

''کیوں پتر! اتنی جلدی... ابھی تو ہفتہ بھی نہیں ہوا۔'' اشرف علی نے کہا۔

''وہ تو ٹھیک ہے بڑے نانا! ہمارا بھی کچھ دن اور ٹھہرنے کا خیال تھا مگر کیا کریں... بڑے بھیا کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے... وہ آئی سی یو میں ہیں۔''

''اللہ خیر کرے۔'' اشرف علی نے کہا۔ ''کیا فون آیا ہے؟''

''ہاں... بھابی نے فون کیا تھا... بہت رو رہی تھیں۔'' اوما نے کہا۔ ''دراصل ان سے چھوٹے بھائی ملائیشیا گئے ہوئے ہیں اور وہ ابھی نہیں آ سکتے... وہاں کسی نے ان کو لوٹا... جتنا روپیا پیسا تھا وہ گیا... ساتھ ہی پاسپورٹ بھی چلا گیا۔''

''اوہو...'' بشیر علی نے کہا۔ ''پھر تو تمہیں ضرور جانا چاہیے۔''

بھی نہ ہو، ورنہ حسد کرنے والے تو ایک طرف... پہلے حکومت آجائے گی کہ ادھر لاؤ مالِ غنیمت... پھر ڈاکو آجائیں گے... پھر حصہ مانگنے والے دوسرے۔

موہن لال نے بڑی مشکل سے ایک صراف کا پتا چلایا جو اس کے کسی عزیز دوست کا ماموں تھا اور اس سے کہا کہ ان کا کچھ خاندانی زیور ہے... پرانے وقتوں کا سونا ہے جسے وہ اب مجبوراً بیچ رہے ہیں لیکن یہ نہیں چاہتے کہ کسی کو بھی پتا چلے... اس نے تسلی دی اور انہیں گھر بلا لیا۔

پہلی کھیپ کے طور پر وہ اپنی دولت کا دسواں حصہ تقریباً چالیس تولے سونے کا زیور لے گئے... صراف ماموں نے زیور دیکھا اور ایک نظر میں بتا دیا کہ یہ تو سونا نہیں پیتل ہے... بس اس پر سونے کی پالش ہے... مزید تصدیق انہوں نے کسوٹی سے پرکھ کے کر دی۔

میاں بیوی جب منہ لٹکائے گھر لوٹے تو انہیں ایک پارسل موصول ہوا جو کسی بین الاقوامی کوریئر کمپنی کے ذریعے پاکستان سے آیا تھا... پارسل کے اندر ایک ماتھے کا ٹیکا اور ایک خط برآمد ہوا... خط میں لکھا تھا:

”برخوردار موہن لال!

تمہارے واپس جانے کے بعد دوسرے دن ہی صفائی کے دوران ہم نے وہ جگہ دیکھ لی تھی جہاں سے تم نے فرش کاٹ کے کچھ نکالا تھا اور ساری بات ہماری سمجھ میں آگئی تھی۔ غالباً یہ تمہاری دادی کے ماتھے کا ٹیکا ہوگا جو تم پیچھے چھوڑ گئے تھے... یہ ہم تمہیں ارسال کر رہے ہیں۔ تمہارے آنے اور قیام کرنے کا مقصد بھی ہم پر واضح ہو گیا لیکن ہم نے برا نہیں مانا کیونکہ یہ تمہارا تھا، اسے حاصل کرنے کی کوشش کرنا تمہارا حق تھا۔

تمہیں صرف ایک بات بتانا مقصود تھی۔ ہمیں یہ تو علم نہیں تھا کہ تمہارا دادا اپنا زیور اسی گھر میں گاڑ گیا تھا... لیکن یہ معلوم تھا کہ جس دولت کو اس نے سونے کے ڈھیر میں تبدیل کیا تھا، وہ نقلی تھا... اس نے اپنی زمین ہماری وساطت سے بیچی تھی اور اپنی حویلی بھی ہمیں مفت نہیں دی تھی... وہ پکا بنیا تھا... اس کے باوجود کہ ہم جانتے تھے کہ اس نے یہ ساری جائیداد اور دولت کیسے حاصل کی تھی، ہم نے اس سے دغا نہیں کی۔ ہم نے اسے نقلی نوٹ نہیں دیے... اگر وہ ہم پر اعتبار کرتا تو ہم اسے اصلی سونے کے زیور بنوا کے دیتے جس کے لیے ہم نے کوشش بھی کی تھی... لیکن ہم سے بات کر کے اس نے ایک ہندو جوہری رتن ناتھ سے زیورات بنوائے جو ان کا خاندانی سنار تھا... یہ سارا نقلی سونے کا زیور اسی نے دیا تھا۔

رتن ناتھ نے اپنی ساری دولت نوٹوں کی شکل میں جمع کی تھی لیکن اسے وہ اپنے ساتھ نہ لے جا سکا... حملہ آوروں نے اس کے گھر کو آگ لگا دی اور عام خیال یہی تھا کہ وہ اور اس کی فیملی کے تمام افراد جل کے مر گئے... مکان پر کسی نے قبضہ کر لیا... اس کی مرمت کرائی اور رہنے لگا... چودہ سال بعد وہ جگہ کسی اور نے خرید لی... اس نے مکان گرا کے نئی تعمیر کی... جب بنیادیں کھودی جا رہی تھیں تو نیچے سے لوہے کا ایک صندوق نکلا جو نوٹوں سے بھرا ہوا تھا مگر وہ سب کاغذ کے پرزے ہو گئے تھے۔ چودہ سال میں نوٹوں کے ڈیزائن دو بار بدل چکے تھے۔

ظاہر ہے یہ سب رتن ناتھ جوہری کی جمع پونجی تھی جو وہ اپنے ساتھ نہ لے جا سکا... اتفاق سے اگلے ہی سال مجھے خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ کے مزار پر حاضری کی سعادت نصیب ہوئی... وہاں میں نے رتن ناتھ کو فقیروں میں دیکھا۔ اس کی حالت بہت خراب تھی لیکن میں نے اسے پہچان لیا... جب میں نے اس سے بات کی تو وہ بہت رویا... کچھ اپنے بیوی بچوں کو یاد کر کے جو جل کے مر گئے تھے... کچھ اپنے اعمال کو یاد کر کے جو اس کے کام نہ آئے تھے... اس نے میرے سامنے علاوہ اپنے دیگر جرائم کے یہ بھی اعتراف کیا کہ اس نے رائے بہادر چمن لال کو پانچ سیر سونے کے بجائے پیتل کے زیورات بنا کے دیے تھے۔

جب تم نے مجھ سے پوچھا کہ آخر چمن لال کا وہ سارا زیور کہاں گیا... تو بات میری سمجھ میں آگئی تھی... میں نے یہ بھی سمجھ لیا تھا کہ تم اسی سونے کے چکر میں آئے ہو... تمہارا اپنے دادا کے کمرے میں سونے کا اصرار کوئی جذباتی وجہ نہیں رکھتا تھا... اس کے باوجود میں نے تمہیں پورا موقع فراہم کیا کہ تم وہ خاندانی سونا نکال لو... کسی نے بھی تمہاری کامیابی کی راہ میں رکاوٹ نہیں ڈالی۔

اب تمہیں اندازہ ہو جانا چاہیے کہ ہم پاکستانی کتنے مہمان نواز ہوتے ہیں... لیکن یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ ہم بے وقوف نہیں ہوتے... خیر خواہ!

تمہارے چھوٹے بڑے (دشمن) نانا۔

بشیر علی اشرف علی بقلمِ خود۔

نوٹ: یہ ٹیکا جو تمہاری دادی کی نشانی ہے، اصلی سونا ہے۔ یہ اس کے سہاگ کی نشانی تھا جو ہمیں حویلی میں ملا تھا... یہ ہم تمہاری بیوی اوما کے لیے بھیج رہے ہیں... تا کہ وہ یہ نہ کہے کہ اس کے دشمن نانا سسروں نے اسے کچھ نہیں دیا۔ خالی ہاتھ واپس بھیج دیا۔“